جاتے میں) راستہ تبدیل کرتے تھے"۔

اس کی متعدد حکمتیں ہوسکتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: دونوں راستے نمازی کی عبادت اور ذکر پر گواہی دیں، دونوں راستوں پر اسلامی شعار کا اظہار ہو اور دونوں راستوں پر بے نمازیوں اور اللہ کی عبادت سے غافل رہنے والوں کو اپنے عمل سے یادِ خدا کی طرف مائل کیا جائے۔

ون وے ٹریفک کا نظریہ

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے سے آنے جانے والوں کے لئے سہولت ہو، اژدہام اور بھیڑ میں کمی واقع ہو اور گزرگاہ تنگ نہ ہو۔ ہم بجا طور پر دنیا والوں کے سامنے یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جدید تمدن، معاشرت اور شہری زندگی کے مسائل کو اپنی تعلیمات کے ذریعے نہایت سہل انداز میں حل فرمایا ہے اور یہ کہ One Way Traffic کے اصولوں کے بانی ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں۔

عید نہ منانا

قوموں کی زندگی میں المیے، حوادث اور مصائب پیش آتے رہتے ہیں اور بدقسمتی سے گزشتہ برسوں سے اس طرح کے المناک واقعات ہماری روزمرہ زندگی کا ایک معمول بن چکے ہیں۔ ایسے حوادث کے پیش نظر اکثر اوقات بعض افراد یا حلقوں کی جانب سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اس سال ہم عید نہیں منائیں گے۔ اس طرح کے بیانات کے پیچھے یقیناً نیک نیتی، حب الوطنی، اخوت اسلامی اور انسانیت دوستی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عید نہ منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی جشن یا تہوار تو ہے نہیں، یہ تو عبادت اور سنت مصطفیٰ ﷺ ہے، اخوت اسلامی اور اتحاد امت کا مظاہرہ ہے، جمعیت قوم مسلم کا ایک حسین منظر ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانہ نماز عید کی ادائیگی کا نام ہے۔ شرافت، متانت اور نفاست ایسی انسانی خصوصیات کا مظہر ہے ان میں سے کوئی چیز اور کوئی بات ایسی نہیں جو عسر و یسر اور رنج و راحت ہر حال میں منائے جانے کے قابل نہ ہو۔ باقی رہا لہو و لعب میں مشغولیت، رقص و سرود کی محافل برپا کرنا، ناؤ نوش اور محرمات شرعیہ کا ارتکاب اور ہوس نفس کی تسکین کے سامان بہم پہنچانا، یہ ایسے امور ہیں جن کا اسلامی تصور عید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ایک مسلمان کو نہ صرف عید کے مقدس موقع پر بلکہ زندگی کے ماہ و سال کے ہر لمحہ و لحظہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں بلکہ ان محرمات و منکرات شرعیہ کو چھوڑ نا ہی ایک مومن کامل کی حقیقی عید ہے اور ایسی عید اللہ تعالیٰ ہر بندۂ مومن کو نصیب فرمائے۔

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

"الرسول النبی الاُمّی" کا معنیٰ مُرادی

محمد عارف خان ساقی

استاذ شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

نحمده و نصلّی و نسلم علی الرسول النبی الامی وآله واصحابه وأمته اجمعین.

قرآن مجید میں حضور رسالتمآب ﷺ کی ایک صفت "الرسول النبی الاُمّی" بیان ہوئی ہے۔ جس انداز سے قرآن حکیم نے آپ ﷺ کیلئے یہ کلمہ استعمال کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُمّی ہونا آپ ﷺ کا وہ امتیازی وصف ہے جس سے بنی اسرائیل کے انبیاء کرام اور سولان عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام متصف نہیں ہوئے۔ اس معاملے میں اب تک ہمارے علماء کے درمیان یہ بحث چل رہی ہے کہ قرآن حکیم میں آپ ﷺ کے لئے الرسول النبی الامی کے کلمات کو ایک امتیازی وصف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے تو یہاں "اُمّی" سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ اس سلسلے میں علماء کے متعدد اور مختلف اقوال ہیں۔

یوں تو انبیاء کرام کو ان کے حالات و زمانہ اور معروضی ضرورتوں کے تحت فضائل و معجزات سے سرفراز فرمایا گیا اور یکسانی و مساوات کہیں نہیں پائی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی خصوصیات ہیں اور ہر کسی کے اپنے امتیازات۔ مگر آپ ﷺ کا امی ہونا محض ایک امتیازی وصف ہی نہیں بلکہ نبی موعود کی شناخت و پہچان کی ایک علامتِ خاص بھی ہے۔ ایک ایسی علامت جس کے فہم پر نبی ٔ موعود کی پہچان اور شناخت موقوف ہے۔ علامت اور نشان کے درست تعین اور فہم کامل کے بغیر مقصود تک رسائی چونکہ ممکن نہیں ہوتی اس لیے اس کے فہم یقینی کا حصول اور درست تعین بادیٔ النظر میں ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ احتمالات

دامکانات کے دبیز پردوں میں اس کو چھپایا اور اقوال کی کثرت میں الجھا اور الجھایا جاتا۔ کیونکہ مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والی علامات کو چھپانا یا مبہم رکھنا بنیادی مقصد اور حکمت کے خلاف ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ وعلی نبینا افضل الصلوات والتسلیمات کی معیت میں بنی اسرائیل کے ستر افراد رب ذوالجلال کی ملاقات کیلئے جاتے ہیں۔ جب وہ سارے اللہ کی پکڑ میں آکر ہلاک ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ واستغفار کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دستِ دعا پھیلا دیئے۔ دعا قبول ہوئی اور جواب ملا:

قال عذابی اصیب به من اشآء ۚ ورحمتی وسعت کل شیء ؕ فسأکتبها للذین یتقون و یؤتون الزکوة والذین هم بأیٰتنا یؤمنون ۔الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التورٰة والانجیل (۱)

"جسے میں چاہوں گا عذاب سے دوچار کروں گا اور میری رحمت ہر چیز سے وسیع تر ہے۔ پھر عنقریب میں اسے ان لوگوں کیلئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور وہ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ وہ لوگ کہ جو اس رسول و نبی امی کی پیروی کریں گے، جس کا ذکر اپنے پاس موجود تورات اور انجیل میں پائیں گے۔"

پھر گفتگو کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور نبی امی کے خصائص کا ذکر آجاتا ہے۔ اس سے صاف مترشح ہے کہ امی ہونا اس نبی معظم کا شناختی وصف ہے جو نبی موعود ہے۔ آپ ﷺ سے متعلق بشارات کا سلسلہ حضرت ابوالانبیاء سیدنا خلیل اللہ علیہ وعلی نبینا افضل الصلوات والتسلیمات کی دعا سے شروع ہوتا ہے۔ تورات کے حوالے سے اس دعا کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ یہاں قرآن حکیم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم اٰیٰتک ویعلمهم الکتٰب والحکمة ویزکیهم ؕ انک انت العزیز الحکیم (۲)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی میں سے ایک عظیم المرتبت رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ فرما دے، تو بڑا ہی مقتدر اور بہت حکمتوں والا ہے۔

یہ دعا خانۂ کعبہ کی تعمیر کے عمل کے دوران مکہ مکرمہ میں مانگی گئی تھی۔ یہ چیز اس بات کا قرینہ ہے کہ جس نبی کی بعثت کی دعا مانگی گئی اس کی بعثت مکہ مکرمہ میں اور اہل مکہ ہی میں سے ہو۔ چنانچہ فہیم اور منصف انہی دو باتوں کا تعین ہو رہا ہے۔ آپ علیہ السلام کے ساتھ اس وقت چونکہ حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام خانۂ کعبہ کی تعمیر کے عمل میں شریک اور مصروف تھے اس لئے یہ دعا بھی آپ علیہ السلام کے حق میں ہوئی۔ مگر حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانوں میں نبوت و رسالت کا جو دور چلا وہ پورے کا پورا آپ علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اثناء میں بنی اسماعیل پہ خاموشی طاری رہی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عہد میں جس نبی موعود کی بعثت کی بشارت دیتے ہیں اس کی بنیاد وہ وحی الٰہی معلوم ہوتی ہے جس کا حوالہ متذکرہ بالا فرمان ایزدی سے ملتا ہے۔ اس موقع پر آپ علیہ السلام کو نبی موعود کی یہ علامت بتا دی گئی تھی کہ وہ "امی" ہوگا۔ اور آپ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی اور نبی جو "امی" نہ ہوگا اس بشارت کا مصداق بھی نہ ہوگا۔ اس مسئلے میں علماء کرام کے اقوال میں جو تعدد اور گوناگونی پائی جاتی ہے اسی سے ان اقوال کی صحت و صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو موقف اختیار کیا اس میں ایک بے اعتدالی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جس پہ از سر نو غور و خوض اور اس موقف سے گریز ضروری ہے۔ اس موقف کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس کلمے سے شان رسالت میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہاں نبی ﷺ کے لئے امی کا لفظ یہودی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری سب قوموں کو امی (گوئیم یا جنٹائل) کہتے تھے اور ان کا قومی غرور کسی امی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار اس پر بھی تیار نہ تھا کہ امیوں کے لئے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "امیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں" (آل عمران آیت ۷۵) پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی امی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے۔ اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لئے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آرہے ہو۔" (۳)

سارے آثار و قرائن تو یہی بتاتے ہیں کہ یہ کلمہ یہود کی اختراع اور وضع کردہ اصطلاح ہے۔ اس حد تک تو مندرجہ بالا موقف درست اور حقائق کے موافق ہے۔ چونکہ یہود کا عیسائیوں کے مقابلے میں

جزیرہ نمائے عرب میں اثر و رسوخ زیادہ تھا اس لئے بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ امی کا لفظ غیر اہل کتاب کے معنی میں انہوں نے ہی استعمال اور رائج کیا۔ مگر عوامی سطح پر عام استعمال میں آ جانے والے ایک کلمے میں یہود کی مکروہ ذہنیت کے آثار تلاش کرنا اور اس کو ان کی کمتر سوچ سے آلودہ کر دینا قطعاً مناسب نہیں۔ زیر بحث آیت مبارکہ مکی سورت کا حصہ ہے۔ اگر ایسی کوئی آلودگی پائی جاتی تو یہ کلمہ کسی مکی سورت میں آپ ﷺ کی صفت کے طور پر شامل تو ہرگز نہ ہوتا کہ یہاں تو ابھی یہود کا سامنا ہی نہیں ہے۔ نہ ان کی زیر دستی یا بالا دستی کا سوال ہی ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے آپ ﷺ کے نام نامی اسم گرامی کو بگاڑ کر مذمم کہنے والوں کو چڑانے کے لئے وحیٔ الٰہی اس کلمے کو آپ ﷺ کا وصف ظاہر کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرے کہ آج تم اسی مذمم کے رحم و کرم پر ہو۔ عیاذاً باللہ ! یہ پہلو دھیان میں ہوتا تو سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ مؤقف یقیناً اختیار نہ کرتے۔ الغرض یہود یہ کلمہ غیروں کے لئے ضرور استعمال کرتے تھے مگر نفرت و حقارت کے اظہار کے لئے نہیں، جداگانہ شناخت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

''جو علم خدا کے نام کے بغیر ہو وہ انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گا'' کے نام سے طبع ہو کر عام لوگوں کے استفادے کے لئے تقسیم ہونے والے ایک مختصر کتابچے میں سید ابوالحسن علی ندوی کا زور اس بات پر ہے کہ امی کا معنی ''ناخواندہ ہونا'' ہے:

''جس پر یہ وحی نازل ہو رہی ہے وہ خود بھی ناخواندہ امی ہے، اس کی پوری قوم ان پڑھ ہے، یہودیوں نے بھی ان کو امیین کے لقب سے پکارا ہے۔'' (۴)

پیر کرم شاہ الازہری کا بھی اس معاملے میں کوئی قول مختار نہیں۔ فرماتے ہیں: ''حضور ﷺ کو ''الامی'' کہنے کی متعدد توجیہات علماء کرام نے بیان کی ہیں'' پھر حسب ذیل توجیہات نقل کرتے ہیں:

۱۔ ''منسوب الی الام یعنی ھو علی ما ولدتہ امہ لم یکتب ولم یقرأ'' یعنی یہ کلمہ ام بمعنی ماں، کی طرف منسوب ہے۔ وہ شخص جو اسی حال پر ہو جس پر اس کی ولادت ہوئی کہ نہ لکھا نہ پڑھا۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کی طرف نسبت کی وجہ سے امی کہا گیا۔

۳۔ بعض کی رائے ہے کہ کہ امی امت کی طرف منسوب ہے۔ یعنی حضور ﷺ صاحب اُمت ہیں۔ (۵)

لغت نویس کہتے ہیں:

''الامی من لا یعرف الکتابۃ ولا القرأۃ'' (۶) یعنی امی وہ ہے جو لکھنا جانتا ہو نہ پڑھنا۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

''الامی ھو الذی لا یکتب ولا یقرأ من کتاب'' (۷) یعنی امی وہ شخص ہے کہ جو کسی کتاب سے پڑھ سکتا ہو نہ لکھ سکتا ہو۔

علامہ جار اللہ زمخشری کے نزدیک امی سے مراد یہود بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک مقام پر '' امیّون '' سے اَن پڑھ یہودی مراد لئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ومنھم أمیّون لا یحسنون الکتب فیطالعوا التوراۃ ویتحققوا ما فیھا (۸)

ترجمہ : اور ان میں سے کچھ اَن پڑھ ہیں، کتاب کے بارے میں بہتر معلومات نہیں رکھتے کہ تورات کا مطالعہ ہی کر سکیں اور یہ تحقیق کر سکیں کہ اس میں کیا کیا احکام ہیں۔

استاذی، علامہ غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں:

''امی وہ شخص ہے جو لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو، یعنی جس طرح ماں کے بطن سے ناخواندہ پیدا ہوا تھا اسی حالت پر ہو اور کسی سے علم حاصل نہ کیا ہو''۔ (۹)

ایک روایت میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ جب لکھا جانے لگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا نام مبارک ''محمد رسول اللہ'' لکھ دیا۔ اس پر مشرکین مکہ معترض ہوئے کہ ہم آپ (ﷺ) کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر جھگڑا ہی کیا رہ جاتا۔ اور اصرار کیا کہ ''رسول اللہ'' کے کلمات ہٹا دیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ کلمات ہٹا دیں۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ کو تامل ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أرنی مکانھا فأراہ مکانھا فمحاھا و کتب ابن عبداللہ (۱۰)

ترجمہ : مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں ''رسول اللہ'' کے کلمات لکھے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ جگہ دکھائی جہاں یہ کلمات لکھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے ان کلمات کو مٹا کر ''ابن عبداللہ'' لکھ دیا۔

حضرات شارحین حدیث نے اس روایت کے ذیل میں بڑی طویل اور تفصیلی بحثیں درج کی

ہیں۔ مگر ان سب کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ امی سے مراد آپ ﷺ کا "ناخواندہ" ہونا ہے۔ استاذی علامہ غلام رسول سعیدی نے اس روایت کی شرح کرتے ہوئے اپنی شرح صحیح مسلم، جلد پنجم کے صفحہ ۵۳۳ سے آپ ﷺ کے امی ہونے سے متعلق بحث شروع فرمائی ہے اور بڑے نامی گرامی علماء کے اقوال و تحریرات سے اپنی بحث کو مزین و آراستہ کرنے کے بعد صفحہ ۵۴۶ پر جا کر اس بحث کو سمیٹا ہے۔ تفصیل جاننے کے خواہشمند اس بحث سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

بر سر مطلب آتے ہیں۔ لفظ "امی" "ام" کی طرف منسوب ہے۔ جس کا لفظی معنی ہے "ماں کا" یا "ماں والا" اردو میں ایک کہاوت مشہور ہے: "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" اس کے پیش نظر ہم امی کا معنی "ماں جایا" بھی کر سکتے ہیں۔ اس سے مراد ہوگی "ماں کا سکھایا ہوا" اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ایک انسان کی پہلی درسگاہ آغوش مادر ہی ہوتی ہے۔ کسی اور درسگاہ کی طرف رجوع نہ پایا جائے تو ایسے شخص کے لئے عربی میں اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ مگر قرآن حکیم میں جہاں جہاں یہ کلمہ استعمال ہوا ان تمام مقامات کو باہم مربوط کر کے دیکھنے کی صورت میں اس کے ایک اور استعمال کا پتا چلتا ہے اور وہ یہ کہ یہ کلمہ "غیر اہل کتاب" کے معنی میں بھی عربی زبان میں مروج اور عام مستعمل تھا۔ ہم مسلمان جس طرح دیگر اقوام اور ادیان و مذاہب کے پیروکاروں کے لئے "غیر مسلم" کی شناختی ترکیب استعمال کرتے ہیں اسی طرح اس دور کے اہل کتاب دیگر ادیان و مذاہب کے پیروکاروں اور دوسری قوموں کے لئے امی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اب آپ غور کیجئے کہ غیر مسلم کی ترکیب جداگانہ شناخت کا فائدہ دیتی ہے اور بس۔ اس سے کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود نہیں ہوتی۔ نہ ہی لفظ "مسلم" کے اندر کسی فخر و غرور یا نفسیاتی برتری کی رمق ہی ملتی ہے۔ یہ بات اس کلمے کی حقیقت سے متعلق ہے ورنہ تو ماحول اور متکلم کا رویہ یا سیاق و سباق کسی بھی کلمے یا ترکیب پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو معنی کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ ساحر لدھیانوی کے اشعار میں "مغل بچہ" کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے۔ موقع و محل کے طور پر یہ بات دھیان میں رہے کہ ساحر نے یہ اشعار نور جہاں کے مزار پر مغل حکمرانوں کے بارے میں کہے تھے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں نوچ لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں "مغل بچہ" کی الفت کے بھرم کی خاطر (۱۱)

لفظ امی کو " لتنذر ام القرى ومن حولها " (۱۲) تاکہ ام القری (مکہ مکرمہ) اور اس کے گرد و پیش کے رہنے والوں کو آپ عذاب الٰہی کے خطرات سے آگاہ کریں، میں وارد "ام

القری" کی طرف منسوب ماننا تو اس لئے غلط ہے کہ یہ قواعد و روایات اہل عرب کے صریحاً خلاف ہے۔ قواعد کی رو سے اس کی طرف نسبت اس لئے نہیں ہو سکتی کہ یہ مرکب اضافی ہے اور نسبت کے لئے منسوب الیہ کا مفرد ہونا ضروری ہے۔ اب تنہا "ام" سے امی بنالیا جائے تو معنی ہوگا: "اصلی" یا "بنیادی" اور "قری" کی واحد قریہ سے اسم منسوب بنایا جائے تو بنے گا "قروی" اور یہ کلمہ کسی بھی بستی کے باشندے کے لئے بولا جا سکے گا، یعنی: "بستی والا"۔ یہ دونوں کلمات باہم مل کر ایک متعین معنی دے رہے ہیں۔ ترکیب کے ٹوٹ جانے سے اس کا مقصد اصلی ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ام القری میں ام (بمعنی جڑ، اصل یا مرکز) مضاف ہے اور القری (بمعنی بستیاں) مضاف الیہ ہے۔ اس ترکیب کا معنی ہے: "بستیوں کی جڑ" یا "مرکزی بستی"۔ اب جداگانہ طور پر کسی بھی اسم منسوب سے "مرکزی بستی کا رہنے والا" کا معنی پیدا ہونا یا مفہوم ادا ہونا ممکن نہیں۔ لفظ "ام" کے ساتھ ایسی ہی ترکیب قرآن مجید میں مجموعی طور پر پانچ جگہ آئی ہے۔ تین مقامات پہ "ام الکتاب" (۱۳) ہے اور دو جگہ "ام القریٰ" (۱۴) کسی ایک مقام کو لیجئے۔ مثلاً سورہ "آل عمران کی آیت کے کلمات ہیں:

منه ايت محكمات هن ام الكتاب و اخر متشبهات (۱۵)

ترجمہ: اس میں دو ہی طرح کی آیات ہیں: محکم، یہ اس کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری، متشابہات۔

یہاں "محکم آیات" کو قرآن حکیم نے ام الکتاب کہا ہے۔ اب کوئی بھی شخص کسی محکم آیت کو "امی" نہیں کہتا۔ نہ "کتابی" ہی کہہ سکتے ہیں۔ پورے طور پر دونوں کلمے وہ معنی ادا کرنے سے قاصر ہیں جو آیت میں وارد ترکیب سے مقصود اور مراد ہیں۔ اس قول کی کوئی ٹھوس علمی بنیاد نہیں ہے کہ "امی" بمعنی "مکی" ہے۔

اسی طرح امی کی "امت" کی طرف نسبت کے قول کا بے بنیاد ہونا بدیہی سی بات ہے۔ اس کی حیثیت اس تنکے سے بھی کمزور ہے جس کا کوئی ڈوبنے والا سہارا لے سکتا ہے۔ ہر نبی چونکہ صاحب امت ہوتا ہے اس لئے کوئی ایسا نبی آئے جو صاحب امت نہ ہو تو امتیاز ہوگا۔ وصف مشترک کو نہ تو امتیاز گنا جا سکتا ہے نہ ہی اس کا بیان مناسب ہوتا ہے۔ مثلاً کسی مجمع عام میں کوئی شخص اپنے بارے میں یہ کہے کہ میں "انسان" ہوں۔ تو باقی یہ پوچھنے کے مجاز ہیں کہ ہم آپ کو کیا نظر آتے ہیں؟ یہ قول قابل اعتبار تو کیا، لائق اعتناء بھی نہیں۔

قرآن مجید میں لفظ "امی" آپ ﷺ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے اور آپ ﷺ کی قوم کیلئے بھی۔ ہر دو مقامات پہ جداگانہ شناخت ہی کا فائدہ دے رہا ہے۔ آپ ﷺ کے لئے حسب ذیل دو آیات میں اس کا استعمال ہوا۔ ان میں سے پہلی آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق متذکرہ بالا واقعہ کے ساتھ مربوط و منسلک ہے۔ اور بارگاہ ایزدی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا یہ جواب ہے:

۱. الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل (۱۶)

ترجمہ : اور وہ لوگ جو اس "غیر اہل کتاب" (امی) رسول و نبی کی اتباع کریں گے جس کا ذکر اپنے پاس موجود تورات و انجیل میں پائیں گے۔

وجہ استدلال یہ کہ نبی موعود کا تذکرہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا گیا تھا کہ ایک عظیم المرتبت رسول آئے گا۔ اس کے عہد میں اس پر ایمان لانے والے ہی میری رحمت کے حقدار ہوں گے۔ تورات اور انجیل میں اس رسول معظم کا ذکر موجود ہوگا۔ اس طرح آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لئے تورات اور انجیل سے رجوع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور شناخت کے لئے صرف تین کلمات بطور صفت لائے گئے ہیں: ان تینوں میں سے رسول اور نبی کے کلمات نہ تو امتیاز اور شناخت کا فائدہ دیتے ہیں نہ ہی نبی موعود کے لئے علامت ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر مبعوث من جانب اللہ رسول ہے یا نبی۔ اب تیسرا کلمہ "الامی" ہے۔ جس کے معنی کے درست تعین پر ہی نبی موعود کی شناخت موقوف ہو جاتی ہے۔ یعنی: "وہ جو اس رسول و نبی کی پیروی کریں گے جو امی ہوگا"۔ پھر حسب ذیل آیت مبارکہ میں جب انہی تین کلمات سے آپ ﷺ کی پہچان کروا کر ایمان لانے کی دعوت دی گئی تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا امی ہونا ایک شناختی علامت ہے۔ اور تورات اور انجیل میں آپ ﷺ کا ذکر اسی شناختی علامت کے ساتھ آیا ہے اور موجود ہے۔ اب دوسری آیت مبارکہ ملاحظہ کیجئے:

۲. فامنوا بالله ورسوله النبی الامی الذی یؤمن بالله وکلمته واتبعوه لعلکم تهتدون (۱۷)

ترجمہ : تو اب لاؤ ایمان، اللہ پر اور اس کے اس "غیر اہل کتاب (امی) رسول و نبی" پر جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لاتا ہے اور اتباع کرو اس کی تا کہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔

مشرکین مکہ بھی اللہ کو مانتے تھے اور یہود تو اپنے آپ کو اجارہ دار گردانتے تھے۔ ان دونوں

کے سامنے دو مسکت دلیلیں پیش کر دی گئیں۔ آپ ﷺ ہی وہ رسول اور نبی ہیں جن کی بعثت کا تمہیں صدیوں سے انتظار تھا۔ اور یہ کہ آپ ﷺ بھی اللہ پر ایمان لانے کی ہی تعلیم دیتے ہیں جس کے تم پہلے سے مدعی ہو۔ پھر تمہارا ایمان سے گریز چہ معنی دارد؟ یہود کے لئے ایک اضافی پیغام بھی ہے کہ غیر اہل کتاب میں سے کوئی اگر اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان لے آئے تو بتاؤ تمہارے پاس موجود تورات اس کے ساتھ کیا رویہ رکھنے اور برتاؤ کرنے کا تمہیں حکم دیتی ہے۔

قبل از بعثت آپ ﷺ غیر اہل کتاب تھے اور "کتاب" کے اسرار و رموز کے محرم و شناسا ہی نہ تھے۔ قرآن مجید نے اس امر سے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی صداقت معلوم کرنے کا ایک قرینہ اور استدلال کا حوصلہ دیا ہے۔ قرآن حکیم اور خود آپ ﷺ کی تعلیمات، خالق کائنات کے بارے میں اور ایک الہامی ضابطہ حیات ہونے کے باب میں جن جن باریکیوں اور لطافتوں پر مبنی اور مشتمل ہیں، کوئی اہل کتاب ان کا دعویٰ کرتا تو کہا جا سکتا تھا کہ اہل کتاب سے صاحب کتاب بننے کا شوق ہوا تو اس الہامی کتاب کی نقل اتار لی ہے جسے پڑھتا پڑھاتا اور لکھتا لکھاتا رہتا تھا۔ کوئی غیر اہل کتاب ایسا دعویٰ کرتو دے مگر اس کی لاج کیسے رکھ سکتا ہے؟ اسی مفہوم کی مظہر آیت مبارکہ ہے:

وما کنت تتلوا من قبله من کتب ولا تخطه بیمینک اذا لارتاب المبطلون (۱۸)

ترجمہ: اور آپ ﷺ نہ تو قبل ازیں کسی کتاب کی تلاوت کرتے آئے ہیں اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے رقم کرتے آئے ہیں ورنہ تو باطل کے پیروکار یقیناً شک میں مبتلا ہو جاتے۔

حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کے جواب میں جس عظیم المرتبت رسول کی بعثت کا تذکرہ فرمایا گیا تھا، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد مبعوث ہونے والے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام فرض نبوت کی بجا آوری کے طور پر اپنے اپنے عہد میں اپنے امتیوں کے سامنے نبی موعود کی بعثت کا ذکر کرتے اور بشارت دیتے آئے ہیں۔ سابقہ امتوں میں اس بات کا تذکرہ اس قدر عام تھا کہ خود ان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پیروکار اپنے اپنے نبی کو نبی موعود ثابت کرنے کے لئے بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ اس طرح کی ایک مثال کلام مقدس کے صفحات پہ ہمیں نظر آتی ہے۔ پیشگوئی کے الفاظ ہیں: "خداوند خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے بھائیوں ہی میں سے میری مانند ایک نبی تیرے لئے برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔" اس کی وضاحت حاشیے پر جا کر یوں کی گئی ہے:

''تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی۔'' اس قطعہ کی رو سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ ان سب انبیاء کا ذکر کرتا ہے جو اس کے بعد آئیں گے۔ لیکن چونکہ خداوند یسوع مسیح وہ بڑا نبی ہے جس میں نبوت اور نبوی عہدہ کمال اور خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ اس لئے ہر دو یہودی اور رسول تسلیم کرتے ہیں کہ اس قطعہ کے الفاظ خداوند یسوع مسیح میں سچے نکلے۔ (۱۹)

واوین میں درج عبارت پہ پہلے غور فرما لیجئے۔ اس کو اقتباس ظاہر کیا گیا ہے اور بظاہر ایک بہت ہی معمولی سا ردو بدل ہے۔ ذرا غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ''ہی'' جو کہ کلمۂ حصر ہے، اب کہیں اور اثر کر رہا ہے۔ یعنی ''بھائیوں'' کی بجائے ''تیرے'' میں حصر ہو رہا ہے۔ پیشگوئی کے الفاظ ہیں: میری مانند ایک نبی مگر اس ''ایک نبی'' کی شناخت کو الجھانے کے لئے کثرت کا پردہ ڈالا گیا: ''موسیٰ ان سب انبیاء کا ذکر کرتا ہے جو اس کے بعد آئیں گے''۔ اب ''لیکن چونکہ'' ''نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ موضوع چونکہ بحث ما نحن فیہ سے قدرے ہٹ کر ہے۔ اس موقع پر اس سے متعلق بس یہی چند اشارات بہت ہیں۔

ایک معمولی سمجھ بوجھ کا حامل شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی مراد ہوتا تو ''تیرے بھائیوں ہی میں سے'' نہ کہا جاتا۔ اس کی موزوں صورت یہ تھی کہ ''تیری اولاد ہی میں سے'' اس لئے کہ آل واولاد کے لئے بھائیوں کا لفظ قطعاً موزوں یا مستعمل نہیں۔ ''تیرے بھائیوں ہی میں سے'' اس امر کی کھلی صراحت ہے کہ نبوت و رسالت کا منصب بنی اسحاق سے نکل کر ان کے چچازاد یعنی بنی اسماعیل کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس بات کی اور شہادتیں بہت ہیں کہ وہ تب تک غیر اہل کتاب ہی رہیں گے۔ بنی اسحاق جو کہ بنی اسرائیل کہلاتے ہیں، میں مبعوث ہونے والے جملہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ''صاحب کتاب'' تو ہوئے مگر یہ منصب ملنے سے قبل وہ ''اہل کتاب'' رہے ہیں۔ ادھر آپ صاحب کتاب تو ہیں مگر آپ ﷺ اہل کتاب نہیں تھے۔ آپ ﷺ کی بعثت غیر اہل کتاب میں سے ہوئی۔ کیونکہ بنی اسماعیل اب تک کسی کتاب کے وارث نہیں تھے۔ آیات متذکرہ بالا میں جو رسول اور نبی کے دونوں مناصب جلیلہ کو ایک ساتھ ذکر فرماتے ہوئے ان کا وصف امی بیان کیا گیا اس سے بھی یہی جادر ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت ایسے دونوں مناصب جلیلہ ایک ساتھ ایک ہی برگزیدہ ہستی میں یکجا ہو کر غیر اہل کتاب میں منتقل ہوں گے۔

اب دیکھئے آپ ﷺ کی قوم کیلئے اس کلمے کا استعمال۔ اور وہ حسب ذیل ہے:

۱. ومنهم أمّيّون لايعلمون الكتب الا امانى وان هم الا يظنون (۴۰)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے کچھ غیر اہل کتاب ہیں جو ''کتاب'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر تمناؤں کی حد تک۔ اور وہ صرف ظن وتخمین کے اسیر ہیں۔

آیت بالا کو حسب ذیل آیت کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے:

ومن الناس من يجادل فى الله بغير علم ولا هدى ولا كتاب منير (۴۱)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے معاملے میں بحثوں میں الجھتے ہیں باوجودیکہ ان کے پاس نہ علم ہے، نہ ہدایت اور نہ ہی کوئی روشن کتاب۔

۲. وقل للذين اوتوا الكتب والاميين ءاسلمتم ط فان اسلموا فقد اهتدوا (۴۲)

ترجمہ: آپ ﷺ کہہ دیجئے: اہل کتاب سے بھی اور غیر اہل کتاب سے بھی، کیا تم نے اسلام قبول کر لیا؟ تو اگر وہ اسلام لا چکے ہیں تو راہ ہدایت پا گئے ہیں۔

پہلی آیت میں امیّون کا وصف بیان ہوا ہے ''لایعلمون الکتب'' اس طرح وہ طبعی خواہشات اور گمانات کے پیروکار ہیں۔ جبکہ علم بس وہ ہے جو من جانب اللہ ہو۔ اس میں اہل مکہ کو سرزنش ہے کہ غیر اہل کتاب ہوتے ہوئے تم اللہ کے معاملے میں بحثیں کرتے ہو۔ تمہاری یہ طرز فکر ظن وتخمین پر مبنی اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن کے مقابل ہے جو ایک الہامی کتاب ہے۔ اور دوسری آیت میں ''امیّین'' کا عطف اہل کتاب پر واضح ہے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ بنی نوع انسان کو بغرض خطاب دو ہی بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا: ایک وہ جو اہل کتاب تھے اور دوسرے وہ جو غیر اہل کتاب تھے۔ اس آیت مبارکہ میں ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر مخاطب فرمانا اتمام حجت کیلئے ہے۔ اب یہ بات واضح ہے کہ اس آیت مبارکہ میں دو ہی ملتوں کا تذکرہ ہے: ایک ''اہل کتاب'' اور دوسرے ''غیر اہل کتاب''۔ تیسری کوئی صورت نہیں تھی۔ اور اگر یہ نہیں تو یا اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ اہل کتاب کے تو پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب سے مگر ان سے ہٹ کر صرف ان پڑھ لوگوں سے ہی یہ سوال کیجئے؟ کیا باقی دنیا کے خواندہ افراد مخاطب نہیں؟ کیا ان کے خواندہ افراد کے لئے یہ فرض کر لینے کی کوئی بنیاد ہے کہ اسلام لائے بغیر بھی یہ لوگ راہ ہدایت پر ہو سکتے ہیں؟ ہمارے موقف کی صحت پر باقی آیات بالعموم اور مندرجہ بالا اور مندرجہ ذیل آیت مبارکہ نص صریح کا درجہ رکھتی

ہیں:

۳۔ ومن أهل الکتب من ان تأمنه بقنطار یؤده الیک ۚ ومنهم من ان تأمنه بدینار لا یؤده الیک الا ما دمت علیه قائما ۗ ذلک بأنهم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ۚ ویقولون علی الله الکذب وهم یعلمون (۷۵)

ترجمہ: اور اہل کتاب میں سے کچھ تو ایسے ہیں کہ آپ (ﷺ) ڈھیروں مال ان کے پاس بطور امانت رکھوا دیجئے، وہ یہ امانت آپ کو لوٹا کے ہی رہیں گے، اور کچھ ایسے ہیں کہ اگر آپ (ﷺ) ایک دینار بھی ان کے پاس بطور امانت رکھوا دیں تو وہ اس کو واپس نہ کریں گے جب تک آپ اس کے سر پہ ہی کھڑے نہ ہو جائیں، اس حرکت کا باعث ان کا یہ قول ہے کہ "غیر اہل کتاب" کے معاملے میں ہم سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر رکھ کے حالانکہ وہ علم کے وارث ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب، "أمیون" کے ساتھ معاملات کے باب میں اپنے آپ کو مذہبی پابندیوں سے آزاد ظاہر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے چشم بصیرت کی دعا ہے۔ اس آیت میں "أمیون" سے "غیر اہل کتاب" کے سوا کوئی اور معنی مراد لینا کسی کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ برینائے بصیرت کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت مبارکہ نے لفظ "امی" کے معاملے میں لغوی استعمال اور اہل عرب کا محاورہ تعلیم فرمایا ہے۔ اہل علم پہ مخفی نہیں کہ فعل، "قالوا" بمفعول کی جگہ مقولہ مانگتا ہے اور اس کا مذکور مابعد "لیس علینا فی الامیین سبیل" اس کا مقولہ ہے۔ اور مقولہٗ یہود ہے۔ وہ ان لوگوں کو جو "اہل کتاب" نہیں، "امی" کہہ رہے ہیں۔ اور یہ مقولہٗ یہود ہے تو عربی زبان میں بمعنی "غیر اہل کتاب" اس کلمے کے عام مروج اور مستعمل ہونے کی اس سے بڑھ کر واضح اور ٹھوس شہادت کہاں ممکن ہے؟ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ یہ کوئی گالی یا پتھر بھی تو ہے نہیں کہ اس کو توہین وتذلیل یا تحقیر وتحقیر پر محمول کر لیا جائے۔

"ناخواندہ" مراد لینے والے انصاف کریں کہ کیا یہود یہ کہتے تھے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ تو ہم اپنے معاملات درست ہی رکھیں گے مگر "ان پڑھوں" کے معاملے میں ہم آزاد ہیں؟ کیا یہود میں بھی خواندہ تھے کوئی ناخواندہ نہیں تھا؟ ادھر قریش مکہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ انہوں نے دنیا گھوم رکھی تھی۔ زمانے کے گرم وسرد سے خوب واقف تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سارے ان پڑھ اور نوشت وخواند

سے بے بہرہ ہی رہ گئے ہوں؟ انہی میں سے کاتبین وحی بھی مہیا ہوئے اور انہی میں سے تھے وہ بھی جو بدر میں قید ہو کر آئے اور فدیہ کی جگہ مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے پر مامور ہوئے۔

ہم مسلمانوں نے بھی انہی سابق اہل کتاب کے چال چلن کی پیروی میں ایسے فتوے صادر کر رکھے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسے عقود وتعاملات دار الحرب میں جائز ہو جاتے ہیں جو دار السلام میں یا مسلمانوں کے مابین ناجائز وحرام ہیں۔ مثلاً سود کے معاملات۔ ہدایت ایزدی کا کام زمان ومکان کی حدوں سے بے نیازانہ اپنے ماننے والوں کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر اور ایک بلندی کردار کی تشکیل ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ جہاں بھی جائیں بس اسی حیثیت اور شناخت کے ساتھ جائیں اور رہیں۔ کیا کوئی صاحب بصیرت قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے اور اس کی روشنی میں فتویٰ دینے پر آمادہ ہے؟

۴۔ هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم ایٰته و یزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة ۚ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (۲۴)

ترجمہ: وہی ذات جس نے غیر اہل کتاب میں انہی میں سے ایک عظیم المرتبت رسول بھیجا، ان پر اس رب ذوالجلال کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ قبل ازیں یہ کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔

اس آیت مبارکہ میں آپ کی بعثت امی لوگوں میں ہونے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا گیا کہ یہ امی اس سے قبل کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔ اور اس کھلی گمراہی سے مراد ان کا ظن وتخمین پر مبنی وہ نظام حیات تھا جسے ان کی زندگی میں وہی رتبہ ومقام اور عمل دخل حاصل تھا جو فقط الہامی دین کا حق ہے۔ یہ آیت مبارکہ بھی اس موقف پر ایک سند کا درجہ رکھتی ہے کہ "الامیین" بمعنی غیر اہل کتاب ہے۔

دیکھئے دعائے خلیل مجسم ہو کر کیسے جلوہ افروز عالم ہوئی کہ ایک طرف بنی اسحاق مدت مدید اور عرصہ بعید تک اہل کتاب کے نمائندہ بنے رہے تو دوسری طرف بنی اسماعیل غیر اہل کتاب میں نمایاں تر اور ایک ممتاز تر حیثیت کے مالک ہوئے۔ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی تائید وتصدیق کے لئے تورات وانجیل کی طرف رجوع کرنے کی تعلیم وترغیب پر مبنی آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ اب آیئے ایک خورد بینی نگاہ ڈال کر تورات سے ہم بنی اسماعیل کے تا دیر غیر اہل کتاب رہنے اور بعد ازیں نوازے جانے کی رمز

بگڑتے ہیں۔ مگر اس سے قبل یہ بات ذہن نشین رہے کہ تورات کے وارث بنی اسحٰق تھے۔ اور یہ انہی کے قبضۂ تصرف میں رہی ہے۔ اس اثنا میں اس کے اندر بے پناہ تحریفات بھی ہوئیں۔ لہٰذا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ بنی اسحٰق ہمیشہ اپنا رتبہ بڑھاتے اور بنی اسماعیل کا رتبہ گھٹاتے آئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر تورات میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی فضیلت و بزرگی کی اصل اساس قائم اور باقی رہ جاتی ہے اور بنی اسماعیل کو کچھ نہ کچھ ہاتھ آ جاتا ہے تو اسے کرشمۂ قدرت ہی کہا جائے گا۔ یہ بات تو مسلمہ تھی کہ باپ کی جانشینی کا حق پہلوٹھے فرزند کو حاصل ہے۔ تورات صراحت کرتی ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حق میں ہی دعا فرمائی تھی اور یہ کہ آپ علیہ السلام کی ولادت پہلے ہوئی۔ گویا پہلوٹھے فرزند بھی آپ علیہ السلام تھے اور دعا بھی آپ علیہ السلام ہی کے لئے تھی۔ اب کنی کترانے کیلئے کوئی بہانہ درکار تھا۔ چنانچہ اب ان کا سارا زور اس بات پہ صرف ہونے لگا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک باندی کے بطن سے تھے:

''اور جب سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس سے ابراہیم کیلئے پیدا ہوا ٹھٹھا کرتا ہے۔ تو اس نے ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا اور ابراہیم کو اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات بری معلوم ہوئی اور خدا نے اسے کہا کہ یہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تجھے بری نہ لگے۔ سب کچھ جو سارہ نے تجھے کہا ہے۔ اسکی بات سن۔ کیونکہ تیری نسل اسحاق سے کہلائے گی۔ مگر میں لونڈی کے بیٹے کو بھی ایک بڑی قوم بناؤں گا کیونکہ وہ بھی تیری نسل ہے''۔ (۲۵)

دیکھیے! حضرت ہاجرہ پہلے تو ''ہاجرہ مصری'' تھیں۔ پھر جب ان کے بیٹے نے اپنے ہی سوتیلے چھوٹے بھائی کے ساتھ پتا نہیں ایسا کیا ٹھٹھا کر دیا کہ حضرت ''ہاجرہ مصری'' یکا یک ''لونڈی'' ہو گئیں۔ اگر حضرت ہاجرہ، لونڈی ہوتیں تو اس مختصر سے اقتباس میں ''لونڈی'' کا لفظ چار بار نہ دہرایا جاتا۔ دہرانا کیا، نہایت بے تکے انداز میں زبردستی گھسیڑا گیا ہے۔ اس بے وجہ تکرار کے باعث کلام کا معیار اور اعتبار دونوں جاتے رہے۔ بر تکمیل تنزل اگر لونڈی تھیں تو سوکنانہ دارو گیر چہ معنی دارد؟ یہ ڈنڈی الگ ماری کہ حضرت ہاجرہ اور آپ کے فرزند کی مکہ معظمہ میں آباد کاری حضرت سارہ کے اصرار پر تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ملی۔ سوکنانہ کشمکش سے ماوراء اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت مانتے تو انہیں خدشہ تھا کہ فضیلت کہیں اودھر ہی نہ چلی جائے۔ رہا یہ سوال کہ آل اسماعیل حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ

والسلام کی نسل کہلانے کا حق رکھتی ہے یا نہیں؟ تو اقتباس مندرجہ بالا سے تو کچھ اسی طرح کا جواب مل رہا ہے کہ ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے''۔ یہ ثابت کرنے پہ تلے ہوئے ہیں کہ ان کو وہ درجہ اور حقوق حاصل نہیں ہیں جو حضرت اسحاق علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو حاصل ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ مگر قدرت خداوندی کے آگے ان کا کیا زور؟ اب تورات کا مطلوبہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اور ابراہیم نے خدا سے کہا: کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ تب خدا نے ابراہیم سے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ سے تیرے لیے ایک بیٹا پیدا ہوگا۔
تو اس کا نام اسحٰق رکھنا اور میں اس سے اور بعد اس کے اس کی اولاد سے اپنا عہد جو دائمی عہد ہے قائم کروں گا اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری سنی۔
دیکھ میں اسے برکت دونگا اور برومند کروں گا۔ اسے نہایت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ لیکن میں اپنا
عہد اسحاق سے قائم کروں گا جو سارہ سے اگلے سال میں اس وقت پر تیرے لیے پیدا ہوگا''۔ (۲۶)

اپنا عہد جو دائمی عہد ہے کی عبارت مترجمین یا راویوں کی کسی غلط فہمی کے باعث بدل گئی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بدنیتی کے تحت تحریف شدہ ہو۔ اصل عبارت کچھ یوں یا اس کے مشابہ تھی کہ ''عہد جو لگاتار، متواتر، مسلسل یا پے در پے رسولوں کی بعثت پہ مبنی عہد ہے''۔ اس امر کی نشاندہی قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ سے ہوتی ہے:

ولقد ارسلنا نوحاً و ابرهيم وجعلنا فى ذريتهما النبوة والكتب فمنهم مهتدٍ ۚ وكثير منهم فسقون ○ ثم قفينا على اٰثارهم برسلنا و قفينا بعيسى ابن مريم واٰتينه الانجيل (۲۷)

اور ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو رسول بنا کے بھیجا اور ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی، پھر ان میں کچھ ہدایت یافتہ ہوئے اور ان میں نافرمانی کرنے والے بھی بہت ہوئے۔ پھر ہم نے ان کے بعد پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ہم نے اس لڑی کے آخری سرے پر عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی''۔

قَفَّيْنَا : قفا، يقفو، قفوا و قُفُوًّا ''کسی کے پیچھے چلنا یا ہو لینا'' سے باب

تفعیل کا کلمہ ہے۔ لفظ "قافیہ" اسی سے مشتق کلمہ ہے اور اس کا معنی ہے:

....."من کل شئی آخرہ"(۲۸) یعنی ہر چیز کا آخر۔ اسی وجہ سے شعر کے آخری کلمے یا آخری حرف کو بھی "قافیہ" کہا جاتا ہے۔

یہ کلمہ آیت بالا میں دو جگہ آیا ہے۔ پہلے مقام پر "پے در پے" کا معنی دے رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے "ہم نے ان دونوں کے بعد یکے بعد دیگرے، لگاتار یا پے در پے رسول بھیجے"۔ ظاہر ہے کہ دوسری جگہ بھی اگر یہی معنی مقصود ہوتا تو اعادے کی حاجت نہ تھی۔ اس سلسلے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ پہلے مقام پر قفینا کا اولین صلہ "علی" سے لایا گیا۔ جو برتری، تفوق اور تعلی کیلئے آتا ہے اور اطار کے مقابلے پر بھی موزوں اور مناسب ہے۔ دوسرے مقام پر قفینا کا صلہ براہ راست "ب" سے لایا گیا جو الصاق کیلئے آتی ہے۔ الصاق کا معنی ہے "چپکانا" لہٰذا اب یہاں لڑی کا آخری موتی جڑنا یا پیوست کرنا ہی اس کا معنی ہوسکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ عربوں کو شعروادب کا جو ذوق اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تھا اس کے پیش نظر پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کے سامنے " قفینا بعیسی " کے کلمات دہرائے جائیں اور ان کا ذہن قافیہ کی طرف نہ جائے۔ لہٰذا " قفینا بعیسی " سے مراد اب یہی ہوسکتی ہے کہ عیسیٰ کو ہم نے اس لڑی کا آخری موتی یا مصرعہ کا قافیہ بنایا۔ اس لحاظ سے بنی اسحاق کے ساتھ جو عہد تھا وہ دائمی عہد نہیں، "عہد تقفیہ" تھا۔ یعنی: "رسولوں کی مسلسل و متواتر اور لگاتار بعثت کا عہد"۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ایک شعر کے لئے دو مصرعے لازمی ہوتے ہیں چنانچہ یہاں مصرعۂ ثانی کی ناگزیریت سے انکار کسی کے لئے ممکن نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے بھی اسی جانب رہنمائی کے قرینے دیئے ہیں۔ مثلاً اس آیت کی ترکیب و بندش پہ غور فرمایئے:

يأهل الكتب قد جاء كم رسولنا يبين لكم علىٰ فترة من الرسل أن تقولوا ماجاء نا من بشير ولانذير فقد جاء كم بشير و نذير والله علىٰ كل شيء قدير (سورۂ مائدہ، آیت:۱۹)

ترجمہ: اے اہل کتاب، ہمارا رسول آگیا ہے تمہارے پاس، حق کی واضح تعلیم دے رہا ہے تمہیں، "رسولوں سے کچھ فترت پر"، کہیں تم یہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر آیا نہ نذیر، تو اب بشیر و نذیر آگیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

"رسولوں سے کچھ فترت پر" لفظی ترجمانی ہے "علىٰ فترة من الرسل" کی۔ مفسرین کرام نے اس ترکیب کی تفسیر حسب ذیل کی ہے:

﴿على فترة﴾ متعلق بجاء كم، اى جاء كم علىٰ حين فتور من ارسال الرسل و انقطاع الوحى

زمخشری، محمود بن عمر جار اللہ، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، نشر ادب الحوزۃ، جلد اول، ص:۶۱۹ نیز

رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر فخر الدین، تفسیر کبیر، شرکت صحافی نوین، جزء:۱۱، ص:۱۹۴

ترجمہ: ﴿على فترة﴾، جاء كم سے متعلق ہے، یعنی تمہارے پاس آیا ہے رسولوں سے وقفے پر جب وحی کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ بہت سے رسولوں سے یکبارگی وقفہ کیسے ممکن ہے؟ جب تک کہ ان کو ایک ہی وحدت کی لڑی میں پرو نہ دیا جائے۔ کیونکہ وقفہ تو دو رسولوں یا نبیوں کے مابین ہوسکتا ہے۔

الازہری، کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، سورۂ مائدہ، آیت:۱۹۔ لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، جمادی الثانی ۱۴۰۲، جلد اول، ص:۴۵۷

سعیدی غلام رسول علامہ، تبیان القرآن، لاہور، فرید بک اسٹال، طبع ثالث ۱۹۹۹، جلد اول، ص:۴۵۹

اور اگر ایک سے زائد ہیں تو پہلے اور آخری کے مابین باقی حائل ہیں۔ پھر "رسول" کی بجائے اس کی جمع "رسل" لانے سے آخر کیا مقصود ہے؟ یہی نا کہ عہد اولین یعنی بنی اسحاق میں مبعوث ہونے والے جملہ رسولان عظام ایک ہی لڑی کے موتیوں اور ایک ہی مصرعہ کے کلمات کی مانند مربوط و منظم ہیں اور عہد ثانی مصرعۂ ثانی کی مانند۔ اور "فترة" کا کلمہ یہاں دو مصرعوں کے مابین وقفہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس "عہد تقفیہ" میں بنی اسماعیل کا نمایاں طور پر کوئی مقام اور حصہ نہیں تھا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے فرزند تھے۔ اور خود تورات گواہ ہے کہ دعائے خلیل ان کے لئے نہ تھی۔ "کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے"۔ کہہ کر حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دائمی زندگی تو اپنے ولی عہد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے مانگی تھی۔ پھر "اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری سنی"۔ کے کلمات سے ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کلمات اس دعا کی

قبولیت کی سند ہیں۔ اب ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا سوچیے کہ پھر بھی بنی اسحاق پر نوازشوں اور عنایات کا یہ عالم ہے تو پہلوٹھے فرزند، جو ولی عہد بھی ہے اور جس کے حق میں دعا بھی مانگی گئی ہے، کی آل پر نوازشات کا عالم کیا ہوگا؟ یہ تو عہد تقفیہ کے مقابلے میں کئی چند ہونی ہی چاہئیں۔ چنانچہ اس شاخ ابراہیمی پر ایک ہی گل سرسبد آیا، جو سارے عالم کو مہکا گیا۔ موتیوں کی وہ پوری مالا ایک طرف اور دُرِ یتیم ایک طرف۔ کہنے دیجئے

حسن یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اب اس مالا کے آخری موتی کی گواہی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے عہد کے اختتامی مرحلے میں نبی آخرالزماں ﷺ کے اور بھی کئی خصائص کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان میں سے منقول و مروی مندرجہ ذیل جملہ خاص طور سے قابل غور ہے:

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ وکیل تمہارے پاس نہ آئے گا۔" (۲۹)

تفصیلی گفتگو کہیں اور ہوگی۔ سردست مقدمہ حشر کے اہم اور بنیادی کردار "وکیل" اور "گواہ" کے باہم مناسبت کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن مجید کی ان آیات کو نگاہ میں رکھ لیجئے:

فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید و جئنا بک علی هؤلاء شهیدا ۵ یومئذ یود الذین کفروا و عصوا الرسول لو تسوىٰ بهم الارض ط ولا یکتمون الله حدیثا ۵ (۳۰)

ترجمہ: پھر سوچو کہ کیا ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب کے اوپر آپ کو گواہ کر کے پیش کریں گے۔ اس روز وہ سب لوگ، جنہوں نے کفر کی راہ پکڑی اور رسول معظم کی نافرمانی کا راستہ اختیار کیا تھا، جی جان سے چاہیں گے کہ اے کاش انہیں دفن کر کے اوپر سے زمین ہموار کردی جائے، اور کوئی بھی بات اللہ سے چھپا نہ سکیں گے۔

بات تھی تورات کے اقتباس کے حوالے سے تو آیئے واپس چلتے ہیں۔ "کاش کہ اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے" سے مراد تھی کہ اسماعیل علیہ السلام کا نام ہمیشہ کیلئے روشن ہو جائے اور روشن ہی رہے۔ مگر بات پھر جاتی ہے حضرت اسحاق علیہ السلام کی طرف۔ اور ان کے ساتھ ایک عہد باندھنے کی

بات چل پڑتی ہے جسے ہم قرآن حکیم کی روشنی میں "عہد تقفیہ" یا عام فہم الفاظ میں "عہد تسلسل" کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ "اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری سنی" یعنی اس کا نام بھی روشن ہوگا اور ہمیشہ کیلئے روشن ہوگا اور رہے گا۔ مگر پہلے نسبتاً ایک مختصر وقفے کیلئے دوسرے نمبر پر پیدا ہونے والے فرزند کو باری ملے گی۔ یہ ترتیب زمانی کا بیان ہے۔ اسلئے کہ ہمیشہ کیلئے تو بس اسی کا نام رہے گا جو سب سے آخر میں آئے۔ اور جس کی شریعت رہتی دنیا تک رہے گی۔ کبھی منسوخ نہ ہوگی۔ اس مقام پر آ کر یہ بات اور بحث خود بخود قرآن حکیم کی اس آیت کے مفہوم سے مربوط ہو جاتی ہے:

ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله و خاتم النبیین ط وکان الله بکل شیء علیما (۳۱)

ترجمہ: محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسماعیل اپنے مورث اعلیٰ حضرت سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اپنے جد امجد حضرت سیدنا اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کی باقیات سے اور وہ بھی کسی حد تک وابستہ ضرور تھے اور رہے۔ مگر صحیفۂ ابراہیمی پہلے وقتوں میں ہی یعنی تورات کے نزول سے بھی بہت پہلے ساکنان عالم ارضی کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ لہٰذا بنی اسماعیل کیلئے اہل کتاب کہلانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ بہت پہلے یہ "غیر اہل کتاب" کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے۔ تورات کے اقتباس مندرجہ بالا سے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ ان کی یہ حالت محض اتفاقی بھی نہیں تھی۔

ممکن ہے کائنات کے کہنہ نظام میں جو انتشار لگتا ہے وہ انتظام ہو

خانۂ کعبہ، جس کی بنیاد حضرت خلیل اللہ اور آپ کے پہلوٹھے فرزند حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام نے رکھی تھی، میں شرک اور بت پرستی کو داخل کرنے کا الزام بھی ان کے سر نہیں جاتا۔ مکہ مکرمہ کی امارت اور خانۂ کعبہ کی تولیت اس عرصے میں مختلف قبائل کے ہاتھوں میں رہی۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری فرماتے ہیں:

"حضرت اسماعیل کی اولاد میں ان کا دوسرا فرزند قیدار نہایت نامور ہوا ہے۔ قیدار کی اولاد، خاص مکہ میں آباد رہی۔ انہوں نے اپنے باپ کی طرح اس مقدس مسجد کے حقوق کو ہمیشہ پورا کیا جو دنیا کیلئے توحید کی پہلی درسگاہ تھی۔ قیدار کی اولاد میں ۳۷ پشت کے بعد عدنان اول نہایت اولوالعزم شخص

گزرا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی "تبع" نے یمن میں حکومت قائم کر لی تھی۔ عدنان کے بعد اس قوم پر بنی جرہم کا قبیلہ غالب آ گیا۔ اگرچہ وہ ان کے ماموں ہی تھے تاہم بنو جرہم نے ان کو ۲۰۷ء میں مکہ سے نکال دیا تھا کیونکہ بنو اسماعیل نے اب تک بنو جرہم کا بت پرستی میں ساتھ نہ دیا تھا لیکن قصی نے جو عدنان دوم سے پندرہویں پشت میں ہے، پھر مکہ پر قبضہ حاصل کر لیا اور اس نے مکہ میں مشترکہ حکومت کی بنیاد ۴۴۰ء میں رکھی۔ (۳۲)

یہ واقعہ آپ ﷺ کی ولادت سے قریباً ۱۳۱ برس قبل ظہور میں آیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ادھر بنو اسماعیل نے مکہ میں یکجا ہو کر اپنے پاؤں دوبارہ سے مضبوط کیے، ادھر آپ ﷺ کی بعثت کا وقت آ گیا۔ کیونکہ ایک قوم کے پیمانے سے ناپا اور تولا جائے تو ۱۳۱ برس کا عرصہ کسی قوم کی زندگی میں اتنی اہمیت کا حامل بھی نہیں ہو سکتا جتنی اہمیت ایک فرد کی زندگی میں سال سوا سال کے عرصے کو دی جا سکتی ہے۔ یوں بنی اسماعیل خانہ کعبہ کے وارث اور متولی تو بن گئے مگر غیر اہل کتاب کی حیثیت سے۔ اس بات کا یہود کو بھی اعتراف تھا۔ اب تک کتاب و نبوت کا دور بنی اسرائیل کے ایک مخصوص حلقے اور دائرے میں چل رہا تھا۔ اللہ رب ذوالجلال نے جب اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری سنی۔ پر مبنی عہد کا آغاز فرمانا چاہا اور مخصوص اور محدود دائروں سے نکال کر نبوت و رسالت کو عالم گیر کرنا چاہا تو یہ مناصب جلیلہ بنی اسماعیل کے سپرد کر دیے جن میں اب تک کوئی نبوت کوئی رسالت نہیں آئی تھی۔ خود غیر اہل کتاب گنے جاتے تھے اور غیر اہل کتاب میں ممتاز ترین حیثیت کے بھی مالک تھے۔ ادھر حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلوٹھے فرزند کی نسل سے تعلق بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا عالمی سطح پر جملہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کو پیغام حق پہنچانے کے لئے موزوں ترین تھے۔ یہ امر اسلام کی عالمگیریت پر بھی ایک شاہد عدل کا درجہ رکھتا ہے۔

اہل کتاب میں سے ہی کسی نئے نبی یا رسول کے آنے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک نہایت زرخیز زمین کو کوئی دانائے علم و حکمت کاشتکار کھیت کی شکل دیتا ہے اور زمانوں اس کھیت کی سرسبزی و شادابی سارے عالم کو داد نظارہ دیتی رہتی ہے۔ پھر کچھ لوگوں کی بے توجہی اور غفلت کے باعث اس کی رونق و رعنائی میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے اور ہوتے ہوتے وہی کھیت ویرانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی اور دانائے علم و حکمت کاشتکار از سر نو اس کھیت کی شکل درست کرنے کے لئے آتا ہے۔ اور اس کو پھر سے آباد کر ڈالتا ہے۔ بعد والے کو چونکہ ایک بنا بنایا کھیت آباد کرنے کو ملا

ہے لہٰذا اسے اتنی محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی جتنی محنت و مشقت اس کو برداشت کرنی ہوگی جسے بے آب و گیاہ زمین کو ہرے بھرے کھیتوں میں بدل دینے کی ذمہ داری ملی ہو۔ اہل کتاب الہامی دین کی قدروں سے بہت حد تک مانوس اور شناسا ہوتے تھے۔ اور اگر ذمہ داری کی صورت یہ ہو کہ

لتنذر قوما ما انذر اباؤهم فهم غفلون (۳۳)

ترجمہ : تا کہ آپ ایک ایسی قوم کو عذاب الٰہی کے خطرات سے آگاہ کریں جن کے اباء و اجداد کو ان خطرات سے آگاہ نہیں کیا گیا اور وہ غافل ہی رہے۔

اگر مخاطب ان قدروں سے کلی طور پر بے بہرہ ہوں اور باتیں سن کر پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگ جائیں یا وحشی درندوں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑیں اور پھر چشم عالم ان انقلابات کا نظارہ کرے جو آپ ﷺ کے ہاتھوں کچھ یوں صورت پذیر ہوئے کہ خود آپ ﷺ کو بھی بھلے معلوم ہوئے، (۳۴) تو اسے بجا طور پر فتح مبین کہا جا سکتا ہے۔ (۳۵) اور بلاشبہ یہ آپ ﷺ کے معجزات میں ایک عظیم ترین معجزہ ہے۔

اس مؤقف کہ لفظ "امی" مطلقاً "غیر اہل کتاب" کے معنی میں مستعمل تھا اور یہ کہ آپ ﷺ کی بعثت غیر اہل کتاب میں سے ہوئی، کا ایک اور بین ثبوت یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے قریش مکہ کے غیر اہل کتاب ہونے پر زور دیا ہے۔ مثلاً مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ایک "سورہ قلم" میں مشرکین مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ تمہاری سوچ و فکر کسی کتاب کے تابع نہیں ہے۔ لہٰذا نری جہالت پر نظام حیات جیسی نازک اور پر پیچ عمارت کی تعمیر کے لئے ضد بحث مت کرو۔ آیات ملاحظہ ہوں:

أفنجعل المسلمين كالمجرمين O مالكم وقفه كيف تحكمون O أم لكم كتاب فيه تدرسون O ان لكم فيه لما تخيرون O (۳۶)

ترجمہ : کیا ہم اپنے فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو ایک سا کر دیں گے، کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ تم کیسے حکم لگاتے پھر رہے ہو، کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں سے تم سیکھتے ہو، کہ اس کی رو سے تمہیں حق مل گیا ہے اس کا جسے تم خود سے اختیار کر لو۔

یہاں کسی کا ذہن عام دنیوی یا غیر الہامی کتاب کی طرف نہ جائے کہ ان دنوں ایسی کتابوں کا کوئی کلچر نہ تھا۔ "کتاب" کا تصور "الہامی" کے ساتھ وابستہ تھا۔ لہٰذا بس کتاب کہہ دینا ہی کافی ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ مفسرین کرام نے بھی ''ام الکتاب'' کی تفسیر ''من السماء'' سے کی ہے۔ (۳۷)

ایک اور دلیل یہ ہے کہ لفظ ''امی'' جن جن سورتوں میں آیا ہے وہ سب مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں جہاں یہود آباد تھے۔ سوائے ایک سورہ ٔ اعراف کے۔ سورہ ٔ اعراف اگرچہ مکی ہے مگر اس کا زمانہ نزول ہجرت سے تھوڑا ہی عرصہ پہلے کا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب مدینہ کی طرف ہجرت کے لئے مسلمانوں کا ذہن بن رہا تھا۔ ادھر غیر اہل کتاب کو غور و خوض کے لئے ضروری دلائل مہیا کئے جا چکے تھے۔ اور اب اہل کتاب کو بھی براہ راست مخاطب کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ ٔ اعراف کی آیت:۱۵۸ میں اسلام کی عالمگیریت کا اعلان فرمادیا گیا۔ اب اس کا مطلب اس کے سوا کیا رہ جاتا ہے کہ کہ مخاطب فقط مشرکین مکہ ہی نہیں رہے بلکہ اب سارا عالم ہی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ سارا عالم جس میں دو ہی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ''غیر اہل کتاب'' اور ''اہل کتاب'' یعنی پہلے مخاطبین اگرچہ غیر اہل کتاب تھے۔ مگر اب اہل کتاب کی طرف بھی روئے سخن اپنا رخ موڑ رہا ہے۔ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ مکی سورت میں لفظ ''امی'' استعمال ہوا بھی تو اہل کتاب کے تصور کے ساتھ ساتھ۔ دراصل دعوت اسلام لحظہ لحظہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پہلے تو ساری توجہ ان غیر اہل کتاب لوگوں کے حصے میں آئی جو اس مقدس گھر کے وارث اور متولی تھے جسے اللہ کی عبادت کی خاطر لوگوں کو تعمیر کر کے دی گئی دنیا کی پہلی عبادت گاہ ہونے کا شرف حاصل تھا اور جن کے درمیان سے آپ ﷺ کی بعثت مطلوب اور مقدر تھی۔ جب ان میں سے چیدہ چیدہ افراد کار مہیا ہو گئے تو مدینہ منورہ کو عالمی دعوت کا مرکز بنایا گیا۔ اس مرحلے پر چونکہ غیر اہل کتاب میں بعثت ہونے کے باعث اہل کتاب کی اجارہ دارانہ ذہنیت سے شدید مزاحمت متوقع تھی، اس لئے عالمگیریت کا پیشگی اعلان مکہ مکرمہ میں ہی ہوا۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ''الرسول النبی الامی'' اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا حصہ ہے، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا ہے۔ اہل کتاب میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت کا دعویٰ رکھنے والوں یعنی یہود کو اس نئی بعثت کے معاملے میں بشارت موسوی کی طرف توجہ دینے اور اسی کی روشنی میں غیر اہل کتاب میں ہونے والی اس بعثت کو سمجھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا کسی بھی زاویہ سے دیکھ لیجئے ''امی'' کا معنی ''غیر اہل کتاب'' ہی سمجھ میں آئے گا۔

خلاصۂ بحث

۱. ''امی'' ہونا آپ ﷺ کا وہ امتیازی وصف ہے جو دیگر انبیاء سے آپ

ﷺ کو جدا، نمایاں اور ممتاز کرتا ہے۔

۲. لفظ ''امی'' کا وہ معنی ہرگز نہیں جسے علماء نے اختیار کیا ہے۔ علماء نے اس کو سمجھنے کیلئے قرآن حکیم کا سہارا نہیں لیا اور اس سے رجوع نہیں کیا۔

لہٰذا قرآن حکیم کے مقابلے پر ان اقوال کو باہمی مشاورت یا تبادلۂ خیال سے زیادہ اہمیت دینا مناسب نہیں ہے۔ مراد قائل کے تعین میں تعدد اقوال تفرقہ پسندی کے مترادف ہوتا ہے۔

۳. امی کا معنی ہے: ''ماں کا سکھایا پڑھایا ہوا''، ''اپنی جبلت پر قائم''، ''اپنی طبعی خواہشات کا پیروکار'' یا ''ہدایت ایزدی کی بجائے فقط اپنے مزعومات و گمانات کے زیر اثر زندگی گزارنے والا''۔

۴. قرآن مجید نے اس لفظ کو اہل کتاب کے مقابلے پر اور غیر اہل کتاب کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا اصطلاحی معنی ہے: ''غیر اہل کتاب''

۵. بنی اسرائیل کے جملہ انبیاء کرام کی بعثت اہل کتاب میں سے ہی ہوئی۔ مگر آپ ﷺ کی بعثت غیر اہل کتاب میں سے ہوئی۔

۶. آپ ﷺ کی امت اور شریعت ''امیہ'' ہیں تو فقط آپ ﷺ کی نسبت سے۔ ورنہ تو یہ دونوں اب کتاب کے زیر اثر ہیں۔

۷. عربی لغات کی ترتیب و تدوین اسلامی افکار کے فروغ سے متاخر ہے۔ اس لئے اس کا ان سے متاثر ہونا چنداں بعید نہیں۔

۸. ''<u>الرسول النبی الامی</u>'' کا مطلب ہے: ''<u>غیر اہل کتاب رسول و نبی</u>''

فصلی اللہ علی الرسول النبی الامی و آلہ واصحابہ وأمتہ و سلم

ماخذ و مراجع

۱. قرآن حکیم، سورۂ اعراف، آیات: ۱۵۶ و ۱۵۷

۲. قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیت: ۱۲۹

۳. مودودی، ابوالاعلیٰ سید، ترجمہ ٔ قرآن مجید مع مختصر حواشی، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، طبع ہشتم نومبر ۱۹۹۰، ص: ۳۵۱۔ تفسیر آیت: ۱۵۸، سورہ ٔ اعراف۔

۴. طبع کردہ ٔ صدیقی ٹرسٹ، کراچی، سلسلہ ٔ اشاعت نمبر ۱۷۵۵، ص: ۲

۵۔الازہری، کرم شاہ پیر، ضیاء القرآن، اعراف: ۱۵۷۔ لاہور، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، جمادی الثانی ۱۴۰۲، جلد دوم، ص: ۹۰ و ۹۱ (ملخصاً)

۶۔لویس معلوف، المنجد، مادہ: ام، تہران، انتشارات اسماعیلیان، طبع اول ۱۳۶۲، ص: ۱۷

۷۔اصفہانی، حسین بن محمد راغب، معجم مفردات الفاظ القرآن، کراچی، میر محمد کتب خانہ، بلاسن طباعت، ص: ۱۹

۸۔زمخشری، محمود بن عمر جار اللہ، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، نشر ادب الحوزۃ، جلد اول، ص: ۱۵۷

۹۔سعیدی، غلام رسول علامہ، تبیان القرآن، لاہور، فرید بک اسٹال، طبع ثالث ۱۹۹۹، جلد اول، ص: ۳۵۹

۱۰۔قشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۵۶، جلد ثانی، ص ۱۰۵

۱۱۔ساحر لدھیانوی، عبدالحی، کلیاتِ ساحر، لاہور، مکتبہ اردو ادب، بلاسن طباعت، ص: ۱۹۳

۱۲۔قرآن حکیم، سورہ انعام، آیت: ۹۳

۱۳۔قرآن حکیم، سورہ آل عمران، آیت: ۷، رعد، آیت: ۳۹ اور زخرف، آیت: ۴

۱۴۔قرآن حکیم، سورہ انعام، آیت: ۹۳ اور شوریٰ، آیت: ۷

۱۵۔قرآن حکیم، سورہ آل عمران، آیت: ۷

۱۶۔قرآن حکیم، الاعراف، آیت: ۱۵۷

۱۷۔قرآن حکیم، الاعراف، آیت: ۱۵۸

۱۸۔قرآن حکیم، سورہ عنکبوت، آیت: ۴۸

۱۹۔کلام مقدس، عہد نامہ عتیق، استثناء شرح، باب: ۱۸، فقرہ: ۱۵، ص: ۲۲۹، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ۱۹۵۸

۲۰۔قرآن حکیم، سورۂ بقرہ، آیت: ۷۸

۲۱۔قرآن حکیم، سورہ قصص، آیت: ۴۰

۲۲۔قرآن حکیم، سورہ آل عمران، آیت: ۲۰

۲۳۔قرآن حکیم، سورۂ آل عمران، آیت: ۷۵

۲۴۔قرآن حکیم، سورہ جمعہ، آیت: ۲

۲۵۔کلام مقدس، تکوین، باب: ۲۱، فقرات: ۹ تا ۱۳، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ص: ۲۳

۲۶۔کلام مقدس، تکوین، باب: ۱۷، فقرات: ۱۹ تا ۲۱، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ص: ۱۸

۲۷۔قرآن حکیم، سورہ الحدید، آیت: ۲۷

۲۸۔لویس معلوف، المنجد، مادہ: ق ف و، تہران، انتشارات اسماعیلیان، طبع اول ۱۳۶۲، ص: ۶۴۷

۲۹۔کلام مقدس، مقدس یوحنا، باب: ۱۶، فقرہ: ۷، مطبوعہ سوسائٹی آف سینٹ پال، روما، ص: ۱۴۳

۳۰۔قرآن حکیم، سورہ نساء، آیات: ۳۱ و ۳۲

۳۱۔قرآن حکیم، سورہ احزاب، آیت: ۴۰

۳۲۔منصور پوری، محمد سلیمان سلمان قاضی، رحمۃ للعالمین، کراچی، دارالاشاعت، طبع اول ذوالحجہ ۱۴۱۱، جلد اول، ص: ۴۹

۳۳۔قرآن حکیم، سورہ یٰسین، آیت: ۶

۳۴۔قرآن حکیم، سورہ فتح، آیت: ۲۹

۳۵۔قرآن حکیم، سورہ فتح، آیت: ۱

۳۶۔قرآن حکیم، سورۂ قلم، آیت: ۳۵ تا ۳۸

۳۷۔زمخشری، محمود بن عمر جار اللہ، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، نشر ادب الحوزۃ، جلد چہارم، ص: ۵۹۴

اَلْاُمّی کے معنیٰ کی تحقیق اور اس کے اطلاقات

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج

استاذ الفقہ و التفسیر

شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

حضور اکرم ﷺ، سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ ﷺ کی بعثت حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعاء کا جواب اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا ظہور ہے۔ آل عمران کی آیت نمبر ۸۱ کی ایک معروف تفسیر کے مطابق، عالم ارواح میں، اللہ تعالیٰ نے سب نبیوں سے آپ کی رسالت پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے کا عہد لیا تھا۔ آپ ﷺ کا آخری پیغمبر ہونا، عالم انسانیت کے حق میں ایک بہت بڑی رحمت اور عالمی سطح پر باہم دگر اتحاد و اتفاق کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اور یہی وہ نکتہ مرکز یہ ہے کہ جو سب اقوام و ملل میں باہمی پیار و محبت اور مودت و رحمت کی بنیاد بن سکتا ہے۔

تمام مذاہب کی کتابوں میں کسی ایک ''آنے والا'' کا جو تذکرہ ملتا ہے۔ وہ دراصل پیغمبر اسلام پر ہی منطبق ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر کوئی دوسرا آج تک نہ اتر سکا اور نہ ہی اتر سکتا ہے۔ دنیا بھر کے تمام مذاہب والے بظاہر آج بھی اس کے منتظر ہیں۔ جبکہ وہ اس دنیا میں آکر سب اقوام کے ایمان و نصرت کا خود منتظر رہا۔ اس کے ماننے والے چودہ صدیوں سے آج تک تمام اقوام و ملل کے منتظر ہیں۔ کہ وہ آگے بڑھیں اور پیغمبر امن و سلامتی اپنا منتظر مان کر، دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنا دیں۔

ہم نے مان ہی لیا، آپ ہیں روح کائنات
لوگ بھی مان جائیں گے، آج نہیں تو کل سہی

آمدم بر سر مطلب! از روئے قرآن حکیم، حضور نبی رحمت ﷺ کو الرسول النبی الامی کے القاب سے تورات و انجیل میں، جو یاد کیا گیا ہے وہ بلا سبب نہیں ہے۔ الرسول اور النبی کے معانی تو سب پر واضح ہیں۔ اس لیئے اس مضمون میں اس پر گفتگو نہیں ہوگی اور ویسے بھی ہمارا موضوع لفظ امی کی توضیح اور تحقیق پر مشتمل ہے۔

لفظ الامی کی وضاحت میں مختلف معنی پیش کیے جاتے ہیں۔ جو کہ یہ ہیں۔

۱۔ ناخواندہ، ان پڑھ، جاہل، بے پڑھا لکھا۔

۲۔ اپنی اصل پر قائم رہنے والا۔ اصل سے مراد فطرت ہے، جس پر وہ پیدا ہوا اور تادم مرگ اس پر قائم رہا۔

۳۔ مکہ کا رہنے والا (بنو اسمٰعیل)

۴۔ صاحب امت یعنی امت والا۔ بایں معنی امت کی ت کو نسبت کے وقت حذف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے مکۃ'' سے مکی اور مدینۃ'' سے مدنی میں ت حذف کر دی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنجناب ﷺ کو جو الامی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اس کا معنی کیا ہے؟ بالعموم ہمارے مترجمین و مفسرین نے الامی کا معنی ان پڑھ، بے پڑھا اور ناخواندہ جیسے الفاظ سے کیا ہے۔ اور اس ظاہری عیب کو آپ ﷺ کا وصف شمار کیا ہے۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

سورۃ الاعراف کی دو متصل آیات (۱۵۷۔۱۵۸) میں آپ کو امّی قرار دیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں یہ ذکر اس طرح آیا ہے:

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل ۔الخ۔

جو لوگ اس رسول، نبی، امی (لقب والے) کی پیروی کرتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

آیت میں ''عندھم'' کی ضمیر، توراۃ و انجیل کے ماننے والوں کی طرف جاتی ہے مراد اس سے اہل کتاب ہیں۔ اور پھر آگے چل کر انہی کتابوں کے ماننے والوں کی تعریف و توصیف بایں الفاظ کی گئی ہے۔

فالذین امنوابہ وعزروہ ونصروہ واتبعو النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون۔

پس جولوگ ایمان لائے اور انکی تعظیم کی اور انکی نصرت وحمایت کی اور اس نور کی پیروی کی، جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا تعارف، کتب ماسبق میں فقط الرسول اور النبی کا نہیں بلکہ الامی کا بھی ہے۔ اور یہی آپکی خصوصیت ہے۔ جس نے آپ کو زمرۂ انبیاء ورسل میں ممتاز کردیا ہے۔ اس لئے امی کا معنی اگر بے پڑھا، ان پڑھ یا ناخواندہ سے کیا جائے اور تفسیری حاشیہ میں کچھ اس طرح وضاحت کردی جائے کہ چونکہ آپ نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں کئے۔ کسی سے کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس لئے آپ کو اُمّی کہا جاتا ہے تو جناب مجھے کہنے دیجئے کہ یہ تعریف تو سب نبیوں پر صادق آتی ہے۔ اسمیں ہمارے نبی کی تخصیص کیا؟ اس معنی کی رو سے کیا حضرت آدم علیہ السلام اُمّی نہ تھے؟ (بلکہ وہ تو بدرجہ اولیٰ تھے) کیا حضرت نوح علیہ السلام نے کہیں سے پڑھا تھا؟ کیا حضرت ادریس علیہ السلام نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیئے تھے؟ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی مکتب میں بٹھائے گئے تھے؟ وقس علیٰ ذلک! اس معنی کی رو سے ہمیں جملہ انبیائے کرام کو اُمّی ماننا پڑے گا اور بایں صورت یہ ہمارے نبی ﷺ کی خصوصیت نہ رہیگی۔ بلکہ یہ وصف بھی نبوت ورسالت کا لازمہ یا عارضہ بن جائے گا۔ حالانکہ مذکورہ بالا آیت کے مطابق تورات وانجیل میں وارد "الامّی" کے وصف امتیازی نے رسول کو الرسول اور نبی کو النبی کردیا ہے۔ یعنی نکرہ کو معرفہ بنادیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اب عام رسول نہیں بلکہ خاص رسول ہے۔ اس طرح عام نبی نہیں بلکہ خاص نبی ہے۔ اور یہ وہ رسول ونبی ہے۔ جو "الامّی" ہے۔ یعنی وہ اُمّ القریٰ کا رہنے والا ہے۔ (اسکی وضاحت ذرا آگے چل کر آتی ہے) یہ وہ نسبت ہے، جسمیں کوئی نبی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت آدم سے لیکر جناب عیسیٰ تک کوئی پیغمبر بھی ایسا نہیں۔ جو اُمّ القریٰ میں پیدا ہوا ہو۔ چنانچہ اس معنی کی رو سے سوائے آپ ﷺ کے کسی پیغمبر کو اُمّی نہیں کہا جاسکتا۔

مذکورہ بالا آیت میں، میں نے اُمّی کا مطلب اُمّ القریٰ کی نسبت سے بیان کیا ہے۔ قبل اس کے کہ میں الاعراف کی اگلی آیت (نمبر ۱۵۸) کی وضاحت کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُمّ القریٰ کی بھی قدرے وضاحت کردوں۔

اُم القریٰ کا لفظی معنی ہے۔ بستیوں کی اصل یا بستیوں کا مرکز یا بستیوں کا مرجع۔ اور قرآن مجید کی رو سے یہ مکہ معظمہ کا معروف نام ہے۔ اس سلسلے میں قرآنی سند ملاحظہ فرمائیے۔

وهذا كتاب انزلنا مبارك مصدق الذى بين يديه ولتنذر أمّ القرىٰ ومن

حولها۔ (الانعام/۹۲)

یہ کتاب (یعنی قرآن) جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ بڑی بابرکت اور اس کتاب کی مصدق ہے جو اس سے پہلے دی گئی تاکہ تم اس کے ذریعے اُمّ القریٰ (مرکزی مقام) اور اسکے تمام اطراف وجوانب کی بستیوں کو انذار کرو۔

اس آیت میں اُمّ القریٰ کا لفظ، مکۃ المکرمۃ کے لئے آیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک آیت اور ملاحظہ ہو:

وكذالك اوحينا اليك قرانا عربيا لتنذر أمّ القرىٰ ومن حولها۔

(الشوریٰ/۷)

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف یہ واضح اور بولتا ہوا قرآن اتارا تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے اُمّ القریٰ (مرکزی مقام) اور اس کے تمام اردگرد کی آبادیوں (یعنی کل دنیا) کو انذار کرو۔ یہاں بھی اُمّ القریٰ کا لفظ مکہ معظمہ کے لئے آیا ہے۔

امام راغب اصفہانی (متوفی ۵۰۲ھ) نے لکھا ہے۔ وقيل لمكة أمّ القرىٰ وذلك لما روى ان الدنيا دحيت من تحتها ؎

اُمّ القریٰ مکہ کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے۔ یعنی وہ زمین کا مرکز ہے۔ اُمّ القریٰ (مکہ) کی جغرافیائی مرکزیت اس لحاظ سے بھی مسلم ہے کہ تمام براعظموں کے مسلمان جیومٹری میں استعمال ہونے والے پرکار، کے مرکزی نقطہ کی طرح اسے اپنا مرکز ومحور سمجھتے ہیں۔ اور قدیم جغرافیہ دانوں کی تحقیق کے مطابق بھی یہ کرۂ ارض کے عین مرکز میں واقع ہے۔ اور جدید دنیا اسکے نیچے آباد ہے۔ گویا وہ معنی جو امام راغب نے کیئے ہیں۔ وہ اپنے ظاہر میں بھی درست ہیں۔۔ نیز اُمّ القریٰ اسے اس لیئے بھی کہا گیا ہے کہ ساری دنیا کو روحانی غذا یہیں سے ملتی ہے۔ کیونکہ خانہ کعبہ کو (جو مکہ میں واقع ہے) تمام دنیا کا قبلہ (مرکز ومرجع) قرار دیا گیا ہے۔ بایں سبب دنیا بھر کے لوگ اُمّ القریٰ میں اس طرح اکٹھے اور جمع ہوتے ہیں جیسے بچے اپنی ماں (اُمّ) کی طرف مراجعت کرتے ہیں اس لئے صحیح معنی میں یہ تمام بستیوں اور آبادیوں کی ماں ہے۔

اُمّ القریٰ میں آپ کا ظہور، دراصل آپ کے "مرکزی رسول" ہونے کا اعلان ہے۔ کیونکہ خاتم النبیین والمرسلین کی بعثت کا مرکز، وہی مقام ہوسکتا تھا۔ جو دنیا کا مرکز ہے۔ بایں معنی اُمّی کا مطلب ہوا۔ مرکزیت ومرجعیت کی حامل شخصیت۔

جسطرح کہ مکہ معظمہ تمام بستیوں اور آبادیوں کا مرکز اور مرجع ہے۔ اسی طرح آپ جناب ﷺ کی ذات گرامی بھی تمام جہانوں کے لئے بطور مرکز اور مرجع کے ہے اور یہی معنی ہے آپ کے الامی ہونے کا۔ جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے۔ وقیل سمی بذلک لنسبته الیٰ ام القری ؎ یعنی آپ کو اُمّ القریٰ کی نسبت سے بھی اُمّی کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جسطرح حضرموت کے رہنے والے کو حضرمی کہا جاتا ہے۔

بعض لوگ ''اُمّ القریٰ'' کی نسبت سے ''اُمّی'' کے لفظ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ از روئے قواعد عربیہ اُمّ القریٰ سے اُمّی کا لفظ نہیں بنتا۔ گو اسکے جواب میں علماء اور محققین کی متعدد شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر میں اس مقام پر قرآن مجید سے استشہاد کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے بعد کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

سورہ قصص کی آیت نمبر ۵۹ میں ''فی امھا'' کے الفاظ آئے ہیں۔ جہاں اُمّ سے مراد ''مرکزی مقام'' کو لیا گیا ہے۔ آیت ملاحظہ ہو۔

وما کان ربک مھلک القریٰ حتیٰ یبعث فی امھا رسولا یتلوا علیھم ایاتنا ۔الخ

تیرا رب، بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کے مرکزی مقام میں رسول نہ بھیج دے، جو ان پر ہماری آیتیں پڑھتا ہو۔

جس طرح ہر نبی کی نبوت کا ایک مرکزی مقام ہوتا ہے۔ اس طرح آنحضرت ﷺ کی نبوت کا بھی ایک مرکزی مقام ہے۔ اور وہ اُمّ القریٰ ہے۔ جسے بطور تخصیص واختصار اُمّ بھی کہا جاتا ہے؎۳ اور بعض مفسرین کے مطابق یہاں ''اُمھا'' سے مراد اُمّ القریٰ یعنی مکہ ہی ہے۔

معاف کیجئے گا۔ بات ذرا لمبی ہوگئی۔ اوپر عرض کیا تھا کہ ''قبل اسکے کہ الاعراف کی آیت نمبر ۱۵۸ کی وضاحت کروں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ اُمّ القریٰ کی وضاحت کردوں۔ سو اس وضاحت کے بعد حسب وعدہ بالا آیت کی تشریح پیش نظر ہے۔

اس آیت میں بھی آپ کو انہی تین القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ یعنی الرسول۔ النبی۔ الامی۔

آیت ملاحظہ ہو:

قل یاایھا الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعا ن الذی له ملک السمٰوت والارض لا الٰه الا ھو یحیی ویمیت فامنو باللّٰہ ورسوله النبی الامی

الذی یومن باللّٰہ وکلمته واتبعوه لعلکم تھتدون۔

اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ اللہ کہ سب آسمان و زمین کی بادشاہت اس کے لیئے ہے۔ کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات وہی جلاتا ہے۔ وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسول، نبی اُمّی پر کہ جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے۔ اسکی پیروی کروتا کہ تم کامیاب ہوسکو۔

اس آیت میں ''یا ایھا الناس'' اور ''الیکم جمیعا'' کے الفاظ کی عمومیت پر کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ دنیا جہاں کے تمام افراد اسمیں شامل ہیں۔ یہ آیت آپکی رسالت کے بیکراں ہونے پر نص کے طور پر وارد ہوئی ہے۔ اس سے آپکی رسالت کی ''مرکزیت'' بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا دعویٰ کسی نبی کے ہاں نہیں ملتا۔ قبل ازیں تمام نبی اور رسول زمان و مکان کی حدود میں نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کیئے گئے۔ جبکہ عالمی نبوت و رسالت کا اعلان فقط اور فقط محمد رسول اللہ نے کیا۔ ظاہر ہے کہ مرکزی رسالت کے اعلان کے لئے مرکزی مقام کا ہونا ضروری تھا۔ اس لیئے اس آیت میں مرکزی رسالت کے اعلان کے ساتھ ہی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو النبی الامی کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ جسکا صاف اور صریح مطلب ہے۔ دنیا کے مرکزی مقام پر ظاہر ہونے والا مرکزی پیغمبر، جسکی دعوت کل عالم کے لئے ہے۔ چنانچہ کل عالم کے داعی کو الامی (یعنی مرکزی حیثیت کا حامل) ہی ہونا چاہیئے ورنہ اس مقام پر اس لفظ کے استعمال کا کوئی دوسرا معنی نہیں بنتا۔

یہ وہ آیات تھیں کہ جن میں حضور ﷺ کو براہ راست اُمّی کے لقب سے ملقب کیا گیا۔ اب ایک اور آیت دیکھئے کہ جسمیں یہ لفظ، حضور نبی اکرم ﷺ کے تعلق سے جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ اس لیئے اس مقام کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایٰته ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ٥ واٰخرین منھم لما یلحقوا بھم وھو العزیز الحکیم ٥ (الجمعہ ۲-۳)

وہ وہی ہے کہ جس نے اُمّی لوگوں میں انہی میں سے (عظمت والے) رسول کو بھیجا۔ وہ ان پر اسکی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ قبل ازیں وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ اور انہی میں کے دوسرے جو ابھی ان سے نہیں ملے۔ اور وہ (اللہ) غالب حکمت والا ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہاں امیین کا لفظ، حضور ﷺ کے تعلق سے کیسے آیا ہے؟ تو میں عرض کروں

گا کہ رسولاً منھم میں جو ھم کی ضمیر آئی ہے اس کا مرجع امیین کے سوا اور کیا ہے؟ یعنی یہ وہ رسول ہے جو انہی امیین میں سے ہے۔ یہاں امیین کا لفظ داعی اور مدعوین دونوں کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس اشتراک لفظی کے تحت امیین کا وہ معنی بیان کیا جائے، جو دونوں میں مشترک ہو اور وہ سوائے اس کے کوئی اور نہیں بنتا کہ امیین سے مراد اہل مکہ کو لیا جائے یعنی اُمّ القریٰ کے رہنے والے۔ اس معنی کی رو سے مذکورہ بالا آیت میں مطلوب جملے کا ترجمہ یہ ہوگا۔ وہ وہی ہے کہ جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک (عظمت والا) رسول بھیجا۔ بصورت دیگر اس کا ترجمہ یہ ہوگا۔ وہ وہی ہے کہ جس نے جاہلوں میں انہی میں سے ایک عظمت والا رسول بھیجا۔ اور یہ ترجمہ کسی طرح بھی حضور ﷺ کے شایان شان نہیں ہے اور نہ ہی مطابق قرآن ہے۔

اب آپ سورۂ جمعہ کی اس آیت کو، سورۂ بقرہ کی روشنی میں دیکھئے۔

ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم... الخ (البقرہ/۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار ان میں (یعنی مکہ والوں میں) انہی میں سے ایک عظمت والا رسول مبعوث فرما۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو تعمیر کعبہ کے وقت، رب کے حضور پیش کی گئی۔ اس دعا میں رسولاً منھم، اس معنی میں آیا ہے جس معنی میں سورۂ جمعہ میں آیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسکے ماقبل سورۂ بقرہ میں" فیھم " کا لفظ آیا ہے اور سورۂ جمعہ میں فی الامیین کا۔ ظاہر ہے کہ "فی الامیین " کا مطلب وہی ہے، جو" فیھم " کا ہے۔ اور فیھم کا مطلب کسی طرح بھی ناخواندہ جاہل اور ان پڑھ نہیں بنتا۔ اس کا مطلب بنتا ہے" انہی میں" یعنی مکہ والوں میں۔ تو لامحالہ فی الامیین کا مطلب بھی یہی ہوگا۔ بصورت دیگر دعائے ابراہیمی اور جواب خداوندی میں کوئی مناسبت نہیں رہے گی۔

یہاں تک تو اُمّی کا معنی آنحضرت ﷺ کے تعلق سے بیان ہوا۔ اب آیئے دو تین مقامات بھی دیکھ لیں کہ جہاں یہی لفظ جمع کے صیغے میں دوسروں کے تعلق سے استعمال ہوا ہے۔ سب سے پہلے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۲۰ اور ۷۵ ملاحظہ ہوں۔

فان حاجوک فقل اسلمت وجھی للہ ومن اتبعن، وقل للذین اوتو الکتاب والامیین ءاسلمتم، فان اسلموا فقد اھتدو، وان تولوا فانما علیک البلاغ، واللہ بصیر بالعباد ٥ (آل عمران/۲۰)

سو اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ میں نے اپنے معبود کے سامنے اپنی گردن جھکا دی ہے اور میرے

متبعین نے بھی اور تم ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی اور امیین یعنی اہل مکہ سے (جو کسی آسمانی کتاب کے مدعی نہیں ہیں) کہہ دو کہ کیا تم بھی (اللہ تعالیٰ کے حضور) اپنی گردن جھکانا چاہتے ہو؟ پھر اگر وہ مان لیں تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو تم پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ اللہ اپنے تمام بندوں (کے اعمال) کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی دعوت صرف امیین یعنی اہل مکہ کے لئے نہیں تھی بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی تھی۔ جنہیں کتاب دی گئی۔ یہاں ان دونوں گروہوں کو یکساں خطاب کرنے میں دراصل اس امر کا اظہار ہے کہ آنحضرت ﷺ کی دعوت، کل عالم کے لئے ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ انعام کی آیت نمبر ۹۲ اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۷ میں" اُمّ القریٰ و من حولھا " کے الفاظ میں آئی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ شہر مکہ کو مرکز اور کل عالم کو اس کا" حول" قرار دے کر، انذار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت اپنے اصل مضمون کے اعتبار سے آنحضرت ﷺ کی عالمی اور مرکزی نبوت و رسالت کی بھرپور آئینہ دار ہے۔

چنانچہ اس آیت میں موجود لفظ امیین سے ان پڑھوں کا مفہوم اخذ کرنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے کہ اہل مکہ، نوشت وخواند سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگر وہ واقف نہ ہوتے تو یہ ہرگز نہ کہتے۔

ولن نومن لرقیک حتیٰ تنزل علینا کتا باً نقروہ۔ الخ (بنی اسرائیل/۹۳)

اور ہم تمہارے (آسمان پر) چڑھنے پر بھی ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم ہم پر ایک کتاب نہ اتار لاؤ۔ جسے ہم پڑھیں۔

ذرا سوچئے یہ مطالبہ کیا نوشت وخواند سے عاری کسی قوم کا ہو سکتا تھا؟ اس سلسلے میں مزید سورۂ مدثر کی آیات (۵۲-۵۳) بھی دیکھئے:

بل یرید کل امریء منھم ان یوتیٰ صحفا، منشرۃ کلاّ ط بل لا یخافون الاخرۃ ٥

بلکہ ان (کفار مکہ) میں سے ہر فرد بشر کا مطالبہ یہ ہے کہ کھلے ہوئے اوراق، لکھے لکھائے صحیفے کی صورت میں انہیں عطا کر دیئے جائیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ لوگ آخرت سے بے خوف ہیں۔

بتایئے! کیا یہ مطالبہ کرنے والے ان پڑھ، جاہل اور نوشت وخواند سے عاری ہو سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

اور اب ہمارے سلسلہ بیان کی پانچویں آیت ملاحظہ ہو:

ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یودہ الیک ج ومنھم من ان تامنہ بدینار لا یودہ الیک الا مادمت علیہ قائماً ط ذلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل ج ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون ہ (آل عمران/۷۵)

اس آیت میں موجود لفظ ''امیین'' کا ترجمہ بالعموم ان پڑھوں اور جاہلوں کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے نمونے کے طور پر ایک ترجمہ ملاحظہ ہو۔

بعض اہل کتاب تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں تو خزانے کا امین بنا دے تو بھی وہ تجھے واپس کر دیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر تو انہیں ایک دینار بھی امانت دے تو تجھے ادا نہ کریں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تو اس کے سر پر ہی کھڑا رہے۔ اس لیئے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ ہم پر ان جاہلوں (غیر یہودی) کے حق کا کوئی گناہ نہیں۔ یہ لوگ باوجود جاننے کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ (ترجمہ: مولانا محمد جونا گڑھی)

آیت کے مطابق یہاں اہل کتاب کا امیین کے ساتھ امانتوں کے واپس کرنے اور نہ کرنے کا معاملہ بیان ہوا ہے۔ ظاہراً لفظ ''الیک'' کا خطاب، مسلم برادری کے ہر فرد سے معلوم ہوتا ہے۔ یوں بعض اہل کتاب کا یہ معاملہ بالعموم تمام مسلمانوں کے ساتھ تھا نہ کہ مشرکین مکہ کے ساتھ اس لیئے کہ وہ تو ایک دوسرے کے حلیف اور مددگار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امتیاز کے طور پر مسلمانوں کو ''امیین'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اگر یہاں امیین کا معنی جاہلوں اور ان پڑھوں سے کیا جائے تو اسکا مطلب بڑا مضحکہ خیز ہوگا اور وہ یہ کہ وہ (یہودی) پڑھے لکھے لوگوں کو تو انکی امانتیں واپس کر دیا کرتے تھے۔ مگر جاہلوں اور ان پڑھوں کے ساتھ بددیانتی کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی تو کسی کو بھی قبول نہ ہوگا۔

پس آیت کا صحیح معنی یہ ہے کہ بعض اہل کتاب مسلمانوں کو اپنے مذہب کا مخالف سمجھ کر بددیانتی کا ارتکاب کرتے تھے۔ یعنی انکی گمراہی یہ تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ تو کوئی بدمعاملگی نہ کریں لیکن اگر کوئی شخص، کسی دوسرے مذہب کا ہو تو اس کے ساتھ دیانت داری کا مظاہرہ کرنا کچھ ضروری نہ سمجھیں۔ یہی انکی وہ فکری، اعتقادی اور عملی کجروی تھی، جسکی قرآن نے قلعی کھولی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں امیین کا لفظ مسلمانوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ نہ کہ جاہلوں اور ان پڑھوں کے لئے۔

یہاں یہ امر واضح ہو کہ اکثر مترجمین و مفسرین کے برعکس یہاں امین احسن اصلاحی رحمتہ اللہ

تعالیٰ علیہ نے امیین سے مراد بنی اسماعیل کو لیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان ہیں یا مشرک۔ بہر حال انکی تفسیر بھی ایک اعتبار سے ہمارے حق میں ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی یہاں ان پڑھوں کے مفہوم سے انکار کیا ہے۔؎

اور اب ہمارے سلسلہ بیان کی آخری آیت ملاحظہ ہو:

ومنھم اُمیّون لا یعلمون الکتاب الاّ امانی وان ھم الایظنون ہ (البقرہ/۷۸)

ان اہل کتاب میں کچھ نام نہاد علماء (امّیون) ہیں۔ جنہوں نے اپنی جھوٹی آرزوؤں اور خوش فہمیوں کو، کتاب کا درجہ دے رکھا ہے اور محض ظنون واوھام میں مبتلا ہیں۔

یہ آیت اپنے اطلاق وانطباق میں گذشتہ آیتوں سے بالکل مختلف ہے اسمیں امّیون کا لفظ، اہل کتاب (یہودیوں) کے نام نہاد علماء کے تعلق سے آیا ہے۔ مگر معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ یہ سوال کریں کے امّیون کے اس معنی کی سند کیا ہے؟ سو عرض ہے کہ اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو کتاب الٰہی کا درجہ دینے والے علماء ہوتے ہیں کہ جہلا؟ واضح رہے کہ اس امر کی نشاندہی خود قرآن مجید نے اگلی آیت میں کر دی ہے کہ وہ علماء تھے جہلا نہ تھے۔ آیت ملاحظہ ہو۔

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمناً قلیلا ط ۔ الخ (البقرہ/۷۹)

پس افسوس ہے ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں (یعنی اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو فتوؤں کی شکل میں) پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے (یعنی اسمیں جو کچھ تحریر ہے وہ سب احکام خداوندی ہیں) اور یہ سب کچھ اس لیئے کرتے ہیں کہ اس کے بدلے تھوڑا سا فائدہ دنیوی حاصل کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کتابیں لکھنے والے، نوشت وخواند سے ناواقف نہیں ہو سکتے۔ یہ کام تو علماء ہی کر سکتے ہیں۔ کہ اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کو فتوؤں کی شکل میں لکھ دیں اور اسے حکم شریعت بنا دیں۔

بہر حال یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے کہ جہاں امّیون کا لفظ یہود کے لئے آیا ہے نہ صرف یہود بلکہ علمائے یہود کے لئے۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر میں اردو کے دو ایک مترجموں اور مفسروں کے نمونے بھی پیش کر دوں کہ جنہوں نے امّیون کے معنی تو ان پڑھ کے لئے ہیں مگر ساتھ ہی امانی کے معنی پڑھنے

کے لئے ہیں۔ اس طرح اُمّیین کا لفظ خود ان کے نزدیک اپنے معانی (یعنی جاہل، ان پڑھ، ناخواندہ وغیرہ) سے ہٹ گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مولانا محمد جوناگڑھی نے اس آیت کا ترجمہ بایں الفاظ کیا ہے۔

اور ان میں سے بعض ان پڑھ ایسے بھی ہیں کہ جو کتاب کے صرف ظاہری الفاظ کو ہی جانتے ہیں اور صرف گمان اور اٹکل ہی پر ہیں۔ ۵

مفتی احمد یار خان نعیمی رقمطراز ہیں:

لایعلمون الکتاب۔ اس کتاب سے توریت شریف مراد ہے اور علم سے جاننا مراد ہے یا سمجھنا۔ یعنی پڑھ تو لیتے ہیں۔ سمجھتے نہیں۔ ۶

مولانا احمد سعید کاظمی فرماتے ہیں:

اس آیت کریمہ میں "اُمّیون" سے جہلاء یہود مراد ہیں۔ جنہیں توراۃ کا کچھ علم نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ توراۃ پڑھ لیتے تھے لیکن اس کے معنی سمجھنے میں وہ جاہل تھے۔ انہیں توراۃ کے معانی کا کچھ علم نہ تھا۔ ۷

واضح رہے کہ مذکورہ بالا حوالے، ہمارے موقف کے حق میں فقط تائید کے طور پر لائے گئے ہیں جہاں تک آیت میں موجود لفظ اُمّیون کا تعلق ہے وہ قرآنی سیاق کے مطابق پہلے ہی علمائے یہود کے حق میں ثابت کیا جا چکا ہے۔

خلاصہ مضمون کے طور پر عرض ہے کہ:

۱۔ قرآن مجید کی سورۂ اعراف کی دو متصل آیات (۱۵۷۔۱۵۸) میں آنحضرت ﷺ کے تعلق سے جو لفظ الاُمّی آیا ہے۔ اس کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں۔ اور جو مرکز و مرجع ہو، اسکے خاتم النبیین والمرسلین ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کو اُمّ القریٰ میں ظاہر ہونے کی وجہ سے اُمّی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔ جس طرح اُمّ القریٰ، تمام بستیوں کا مرکز اور تمام آبادیوں کا مرجع ہے۔ اسی طرح اُمّ القریٰ کی نسبت سے ظاہر ہونے والا رسول بھی انہی خصوصیات کا حامل ہے۔ یعنی عالمی رسول اور مرجع خلائق۔

۳۔ آپ کے اُمّی لقب ہونے کا تذکرہ توراۃ و انجیل میں پایا جاتا ہے۔ دراصل یہ آپ کی بعثت کی پیش گوئی تھی کہ وہ اُمّ القریٰ کا باسی ہوگا۔ نیز عالمی مرکزی مقام پر ظاہر ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مرکزی یعنی عالمی رسول ہوگا۔ اور یہ اس کے خاتم النبیین والمرسلین ہونے کی دلیل بھی ہے۔

۴۔ سورۂ جمعہ کی آیت نمبر ۲ میں اُمّیین کا لفظ آنحضرت ﷺ کے تعلق سے اہل مکہ کے لئے استعمال ہوا ہے جسکی تفسیر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹ سے بھی ہوتی ہے۔

۵۔ سورۂ انعام کی آیت نمبر ۹۲ اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۷ سے آنحضرت ﷺ کی عالمی اور مرکزی نبوت و رسالت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

۶۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۲۰ میں اُمّیین کا لفظ اہل مکہ کے لیے جبکہ آیت نمبر ۷۵ میں اُمّیین کا لفظ مسلمانوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا مدینے کے۔

۷۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۵۹ میں اُمّیون کا لفظ، علمائے یہود کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۸۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹۳ اور سورۂ مدثر کی آیات نمبر ۵۲۔۵۳ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اہل مکہ نوشت و خواند سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہیں ناخواندہ سمجھنا قرآن کے خلاف ہے۔

حوالہ جات

۱۔ المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۲، الناشر، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ۔ کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں

۲۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد اول (الف مقصورہ) اردو ترقی بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء

۴۔ تدبر قرآن، جلد دوم، ص ۱۲۳، تفسیر زیر آیت نمبر ۷۵، آل عمران، فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۳ء

۵۔ اردو ترجمہ قرآن، جسکا کوئی نام نہیں، شائع کردہ، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب، سنہ اشاعت درج نہیں۔

۶۔ تفسیر نعیمی، جلد اول، ص ۴۵۴، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات، سنہ اشاعت درج نہیں

۷۔ التبیان مع البیان (پہلا پارہ) ص ۲۴۲، کاظمی پبلیکیشنز، انوار العلوم، ملتان، بار اول، ۱۹۹۳ء

قرآن کا تصورِ آزمائش و پیمائش

اعجاز احمد

مددگار پروفیسر، شعبہ تعلیمات، جامعہ اردو، کراچی

ہر دور میں کسی نہ کسی انداز سے اساتذہ کرام اپنے تعلیمی و تدریسی عمل کا جائزہ لیتے رہے ہیں جس طرح زمانے کے اعتبار سے تعلیم کے مقاصد معین رہے ہیں۔ اسی طرح اساتذہ نے اپنے تعلیمی عمل کا جائزہ مختلف ادوار میں مختلف انداز سے لیا ہے کبھی اساتذہ طلبہ کی حاضر جوابی، فن تقریر اور طاقت کا جائزہ لے کر اس کو مفید و بہتر شہری کا خطاب دیا کرتے تھے گویا جس انداز سے بھی خود کا جائزہ لیا وہ امتحان کہلایا۔ اسلامی نظام تعلیم میں تعلیمی عمل کا جائزہ و عمل کی یکسانیت سے لگایا جاتا رہا ہے کہ کسی فرد نے علم حاصل کرنے کے بعد اس پر کتنا عمل کیا۔ اس طرح اسلامی نظام تعلیم میں فرد کے ظاہر و باطن میں یکسانیت کو معیار بنایا گیا۔

اسی چیز کو دیکھتے ہوئے ماہرین تعلیم نے طلبہ کی ہمہ جہتی معلومات حاصل کرنے نیز اس سے رہنمائی حاصل کرنے کا باقاعدہ ایک نظریہ پیش کیا ہے جس کو تشخیص قدر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تشخیص کے لفظی معنی کسی چیز کے بارے میں جاننے، تحقیق کرنے، اور معلومات حاصل کرنے کے ہیں قدر کے معنی خوبی کے ہیں اور یہ دونوں الفاظ باہم مل کر کسی فرد کی شخصیت کی خوبی جاننے کے لئے ایک ضابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں طلبہ کی شخصیت کے جاننے کے اس طریقہ کار کو باقاعدہ با مقصد ہمہ گیر و مسلسل عمل کا نام دیا ہے۔ اس عمل میں مقصدیت کو مسلسل تجربات کی روشنی میں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سعی کی جاتی ہے گویا اس طریقہ کار میں مقصد طریقہ کار اور مسلسل عمل کی ضرورت ہے۔

ذیل میں ہم تشخیص قدر کے مفہوم و عمل کو اسلامی نظر سے دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے مقصد نہیں بھیجا ہے اس کو ایک منظم ضابطہ حیات عطا کیا ارشاد باری

تعالیٰ ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

ترجمہ: جن و انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا (۵۱: الذاریات۔ ۵۶)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جن و انس کو پیدا کرنے کا مقصد رب العزت نے اپنی عبادت قرار دیا ہے اور عبادت یوں کی جائے کہ اس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں شامل ہوں اور دونوں عبادات کا حق مکمل دیانتداری سے ادا ہو یعنی کہ انسان محض حق اللہ ہی میں مشغول ہو کر خلق خدا کے حقوق ادا نہ کر سکے اور نہ ہی ایسا ہو حق العباد کی ادائیگی میں اپنے رب کو بھول جائے اس طرح اپنی دو گونہ عبادت میں اپنے ہر ہر عضو کو قول و فعل کی یکسانیت اور جوابدہی کے لئے تیار رکھنا ہے اس چیز کو اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ (ترجمہ) : اور اس دن سے ڈرو تم اللہ کے حضور لوٹ جاؤ گے پھر ہر شخص کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا اور کسی پر زیادتی نہ ہوگی۔

اس آیت مبارکہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو اپنے ہر عمل کا جواب دینا ہے یعنی جو کچھ وہ اس دنیا میں کرے گا اس کا صلہ اس کو مل کر رہے گا رب کریم ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے۔

وھو الذی جعلکم خلئف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوکم فی ما اتکم

ترجمہ: جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ (۶: انعام۔ ۱۶۵)

آیت کریمہ کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کے ہر عمل کا جائزہ لیا جائے گا اور ان کی آزمائش کی جاتی رہے گی پھر ان کو ان کے معیار کے مطابق درجات دیئے جائیں گے اسلام میں جانچ پر معیار قائم کرنا۔ نتیجہ دینا پھر نتیجہ پر صلہ دینا یہ ایک پورا عمل ہے اور یہ عمل فرد کی شخصیت کی خصوصیات فراہم کرتا ہے اور یہی عمل اسلام کے تشخیص قدر کا نظریہ کہلاتا ہے یوں اسلامی تشخیص قدر کا عمل، مسلسل اور با مقصد ہے۔

اسلامی تشخیص قدر:

اسلامی تشخیص قدر میں فرد کے تمام افعال کا جائزہ ہمہ گیریت کے ساتھ لیا جاتا ہے جس میں فرد کا پیدائش سے لے کر دم مرگ تک کا جائزہ اور ظاہر و باطن قول و فعل شامل ہیں۔ اسلامی نظریہ کے تحت فرد کے قول و فعل میں تضاد کو یکسر رد کر دیا گیا ہے قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

یا ایھا الذین امنو الم تقولون مالا تفعلون

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ (۲۸: الصف۔۲)

گویا اسلام اقوال و اعمال میں تعارض پسند نہیں کرتا۔ وہ ظاہر کو باطن کے آئینے میں اور صورت کو سیرت کے آئینے میں دیکھنا چاہتا ہے یعنی وہ گفتار و کردار میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

واعظان منبر و محراب کو کیسے کہوں
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

دوسری جانب اسلامی تشخیص قدر میں فرد کی جانچ کے لئے اس کے ہر عمل کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے جو پیدائش سے لے کر موت تک جاری رہتا ہے اسلامی تشخیص قدر کا عمل فرد کے انفرادی اختلاف کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام سے چیزوں کے نام پوچھ کر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال کر اور بیٹے کی قربانی مانگ کر۔ حضرت یونس علیہ السلام کو بطن ماہی میں ڈال کر اور حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن دے کر آزمایا گیا۔ نبی آنحضرت ﷺ کو شعب ابی طالب کی گھاٹی میں محصور رکھ کر اور طائف کے بازاروں میں لہولہان کروا کے آزمایا۔ یہ تمام واقعات اسلامی تشخیص قدر کے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں اسی چیز کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا ہے۔

ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات

ترجمہ: اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر و فاقہ کشی جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ (۲: البقرہ۔۱۵۵)

اسی چیز کو سورۃ آل عمران میں کچھ اس طرح بیان کیا۔

لتبلون فی اموالکم وانفسکم

ترجمہ: مسلمانوں تمہیں مال و جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی۔ (۳: آل عمران۔۱۸۶)

گویا ان تمام آیات مبارکہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی تشخیص قدر میں فرد کی مختلف طریقوں سے آزمائش کر کے اس کی شخصیت کا اندازہ لگایا جائے گا کہ وہ کس معیار پر ہے اس لئے سورۃ الملک میں ارشاد ہے:

لیبلوکم ایکم احسن عملا

ترجمہ: تاکہ لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ (۶۷: الملک۔۲)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آزمائش سے فرد کی شخصیت کے معیار کو پہچاننا اور معیار قائم کرنا ہے۔

الغرض اسلامی تشخیص قدر میں ہمہ گیریت، مسلسل عمل، مجموعی ریکارڈ انفرادی اختلاف اور مختلف طریقہ کار کے ذریعے مقصدیت کا پتہ چلایا جاتا ہے کہ فرد کس معیار پر ہے۔

اسلامی تشخیص قدر کا طریقہ کار:

اسلامی تشخیص قدر میں فرد کی شخصیت کی جانچ کے لئے مختلف طریقہ ہائے کار استعمال کئے گئے ہیں جس میں فرد مال سے، جان سے، آبرو سے، کم رزق سے، کم آمدنی سے اور اولاد کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔ اس چیز کو قرآن حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ: اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے آزمائش کریں گے۔

اس آیت مبارکہ میں مختلف طریقہ کار کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ جس انداز سے چاہا جائے گا اسی انداز سے آزمایا جائے گا اور یہ آزمائش بھی الگ الگ و انفرادی طور پر ہوگی کوئی کسی پر بھروسہ نہ کر سکے گا ہر فرد کو اپنے آپ کو خود امتحان کے لئے تیار کرنا ہے اور یہ تیاری بھی اس طرح سے کہ زندگی کا ہر عمل اصول و ضوابط کے تحت ہو اس لئے ارشاد ہوا۔

لنا اعمالنا ولکم اعمالکم

ترجمہ: ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔ (۴۲: شوریٰ، آیت ۱۵)

اسلامی تشخیص قدر میں ہر فرد کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی جائے گی سب کچھ سامنے رکھ دیا جائے گا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ

ترجمہ: پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ (۹۹: الزلزال۔۷، ۸)

وضاحت: قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے جو اچھے یا برے کام کرتا ہے اس کے لئے جواب دہ ہے فرمایا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف لوٹایا نہیں جائے گا" دوسری جگہ ہے کہ "تمہارے کان، آنکھیں اور تمہارا دل

سب سے باز پرس کی جائے گی اسی حقیقت کو یہاں ایک نئے اسلوب سے بیان کیا جارہا ہے کہ بڑے بڑے اعمال حسنہ یا افعال سیہ کا تو کیا پوچھنا اللہ تعالیٰ کے ہاں تو یہ اصول طے پاچکا ہے کہ اگر ذرہ کے برابر کوئی نیکی کرے گا تو اس کو صلہ ملے گا معمولی سے معمولی گناہ کو بھی پورے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا جائے گا"۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر سے یہ بات واضح ہوگی کہ اسلامی تشخیص قدر لیس فرد کی ہمہ گیر معلومات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھ کر اس کے اعمال کا حساب کیا جائے گا اور ان اعمال کو میزان ناپا جائے گا اس چیز کو قرآن حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:

والوزن یومئذ الحق فمن ثقلت موازینه فاولئک هم المفلحون ومن
خفت موازینه فاولئک الذین خسروا انفسهم .

ترجمہ: اور اعمال کا تولنا اس دن برحق ہے۔ پس جن کے بھاری ہوئے ترازو تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں اور جن کے ہلکے ہوئے ترازو تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو۔

(۷: اعراف: ۸)

اس آیت مبارکہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ فرد کو زیادہ اچھے اعمال کے صلے میں جنت ملے گی اور زیادہ بد اعمال کے بدلے میں جہنم ملے گی گویا اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے انصاف کے ساتھ تمہارے ہر عمل کا جائزہ پیش کیا جائے اور اس ہی کے حساب سے نتیجہ بیان کر کے صلہ دیا جائے اس جگہ اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ امتحان میں پاس ہونے کی شرط ۵۱ فیصد ہے۔ دوسری جانب یہ بھی طریقہ بیان کردیا گیا کہ اگر کسی فرد کی نیکیاں اور بدی دونوں برابر ہیں یعنی ۵۰ فیصد نیکی اور ۵۰ فیصد بدی ہے تو ایسے لوگوں کے لئے سورۃ اعراف میں جنت و دوزخ کے درمیان اعراف کا مقام بتایا گیا ہے جہاں وہ لوگ ہوں گے مفسرین کا اجماع ہے کہ ان لوگوں کو جنت دے دی جائے گی اس کے لئے قرآن حکیم میں یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے کہ:

ان الحسنت یذهبن السیات

ترجمہ: بے شک نیکیاں بدیوں کو مٹادیتی ہیں۔ (۱۱: ھود۔ ۱۱۴)

اس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں ایسے شخص پر اللہ کی رحمت غالب آئے گی اور وہ جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ الغرض اسلامی تشخیص قدر میں یہ طریقہ بیان کیا گیا کہ آزمائش جب، جس وقت جس طرح چاہیں لی جاسکتی ہے۔ ہر فرد انفرادی طور پر، خواب وہ ہے اس کی آزمائش اس کی استعداد کے مطابق لی

جائے گی۔ تمام اعمال کو مجموعی ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے گا جو مسلسل عمل کے تحت ترتیب دیا جائے گا پھر اعمال کا حساب ہوگا جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی ان کو پاس کردیا جائے گا یعنی جو ۵۱ فیصد نمبر حاصل کرے گا۔

اسلامی تشخیص قدر پر طائرانہ نظر:

اسلامی تشخیص قدر کو بغور دیکھا جائے تو یہ ایک سائنٹیفک طریقہ کار ہے جس طرح سائنسی عمل میں کسی شے کے بارے میں مکمل تجزیہ کر کے اس کی ہیئت کے بارے میں رائے دی جاتی ہے اسی طرح اسلامی تشخیص قدر میں فرد کی شخصیت کے تمام پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے کارکردگی پر غور کیا جاتا ہے، ہر عمل کا خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی، خواہ بچپن ہو یا بلوغت کا یا خواہ وہ صحت کا ہو یا بیماری کا، آمدنی کی زیادتی کا ہو یا کمی کا، کھیل کے میدان کا ہو یا گھر کے ماحول کا، اندرون ملک کا ہو یا بیرون ملک کا، دوستی کا ہو یا دشمنی کا، المختصر فرد کے ہر لمحے کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور فرد کی جانچ جب چاہی جس انداز سے چاہی کی جاسکتی ہے اور ان اعمال کو میزان کے ذریعے ناپا جاسکتا ہے۔ اور یوں ۵۱ فیصد پر کامیاب قرار دے کر معیار قائم کیا جاسکتا ہے اور پھر نتیجتاً اسی معیار پر صلہ بھی دیا جاسکتا ہے اور یہی ہے اسلامی تشخیص قدر کا نظریہ۔

الغرض اسلامی تشخیص قدر ایک جدید سائنٹیفک طریقہ کار ہے جو جدید تقاضے کے تحت ہے جو ہمہ جہتی معلومات، مسلسل عمل، مجموعی ریکارڈ پر انحصار کرتے ہوئے فرد کی شخصیت کا معیار قائم کرتا ہے۔

قومی نظام تعلیم پر اسلامی تشخیص قدر کا اطلاق

ہمارے نظام تعلیم میں سیکنڈری اسکولوں میں تشخیص قدر کا طریقہ کار ششماہی و سالانہ امتحانات پر منحصر ہے جس میں ششماہی امتحان کو اہمیت حاصل نہیں ہے۔ وہاں امتحان کے حاصل کردہ نمبرات پر معیار قائم کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی تشخیص قدر کا نظام ایک مکمل عمل ہے جو فرد کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا مکمل احاطہ کر کے فرد کی شخصیت کا معیار قائم کرتا ہے جس میں مقصدیت، ہمہ جہتی، معلومات، ذہنی تیاری اور آزمائش بھی شامل ہے۔ گویا تشخیص قدر کا اسلامی نظریہ ایک مکمل اور سائنٹیفک طریقہ کار ہے ذیل میں جس کے نکات کی وضاحت کو ضروری سمجھا گیا ہے۔

۱۔ مقصدیت ۲۔ تیاری ۳۔ وقت ۴۔ امتحانات ۵۔ نمبرات ۶۔ مجموعی ریکارڈ ۷۔ معیار

مقصدیت:

ہمارے نظام تعلیم میں طلبہ کو حصول تعلیم کی مقصدیت سے آگاہ نہیں کیا جاتا جب کہ اسلامی

تشخیص قدر میں فرد کی زندگی کا مقصد بیان کر دیا گیا ہے لہٰذا ہمیں چاہیے کہ طلبہ کو تدریسی مقاصد سے آگاہ کیا جائے اور ان کو یہ بتایا جائے کہ آزمائش انہی مقاصد کے حصول کے تحت ہوگی۔

تیاری:

اسلامی تشخیص قدر میں چوں کہ فرد کے حال کا مسلسل جائزہ لیا جاتا ہے لہٰذا فرد کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جب چاہا جائے گا جس طرح چاہا جائے گا آزمائش میں مبتلا کیا جائے گا۔ گویا یہ فرد کو ہمہ وقت تیار رہنے کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا تشخیصی زاویہ نقطہ نگاہ سے ہمیں اپنے طلبہ کی تیاری اس طرح کرانی چاہیے کہ وہ اپنے تدریسی عمل کی جواب دہی کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے طلبہ کی شخصیت کا مسلسل جائزہ و معیار برقرار رکھنا مقصود ہے یہ بھی بتا دیا جائے کہ آزمائش کس کس انداز سے ہوگی کیوں کہ طریقہ کار اسلامی تشخیص قدر میں واضح کر دیا گیا۔ ''تمہاری آزمائش خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کہ نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے کی جائے گی'' (۱:البقرہ۔۱۵۵)

وقت:

ہمارے نظام تعلیم میں طلباء کی آزمائش کے لئے وقت کا تعین کر دیا جاتا ہے اور طلبہ اس مخصوص امتحان میں کامیابی کے لئے تیاری کرتے ہیں جبکہ اسلامی تشخیص قدر کے نظریہ کے مطابق طلبہ کی آزمائش اچانک بار بار کی جائے تا کہ طلبہ ہر وقت آزمائش کے لئے تیار رہیں جس سے شخصیت کو صحیح معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے اور سال بھر تمام آزمائش جمع کرانا چاہیے تا کہ سال کے آخر میں کامیابی، تعین اور معیار قائم کرنے میں آسانی ہو۔

امتحانی پرچہ:

ہمارے ہاں امتحانی پرچہ ایک جماعت کے تمام فریق کے طلبہ کے لئے بنایا جاتا ہے۔ جب کہ درس و تدریس کا عمل مختلف اوقات میں مختلف انداز سے مختلف اساتذہ کی زیر نگرانی وقوع پذیر ہوتا ہے اور طلبہ بھی انفرادی اختلافات رکھتے ہیں اسلامی تشخیص قدر میں ہر فرد سے استعداد کے تحت الگ الگ امتحان مختلف انداز سے لیا جاتا ہے جس کی مثال انبیاء کرام کی آزمائشیں ہیں اس لحاظ سے ہمیں چاہیے کہ اپنے نظام تعلیم میں اسی انداز سے طلباء کی ذہنی، جسمانی، معاشی اور معاشرتی حیثیت کو جان کر ان کے لئے الگ الگ امتحانات تیار کئے جائیں جس سے طلبہ کی فطری صلاحیتیں ابھریں اور نفسیاتی تقاضے پورے ہوں اس کے لئے تحریری، معروضی، تقریری (مباحثی، مسلکی) زبانی، معاشرتی سائنس کے امتحانات لئے

جائیں کیوں کہ اسلامی تشخیص قدر کے تحت طلبا کی شخصیت کے ہر پہلو کو جاننا ہے اور اس پر معیار قائم کرنا ضروری ہے۔

نمبرات:

ہمارے نظام تعلیم میں ۳۳ فیصد پر پاس کیا جاتا ہے جو کہ اسلامی تشخیص قدر کے خلاف ہے اسلامی تشخیص قدر کے لحاظ سے ہمارے نظام تعلیم میں طلبا کو ۵۱ فیصد پر پاس کیا جانا چاہیے اور پرچہ کی جانچ پر جتنا حق طلبہ کا بنتا ہے اس کی روشنی میں اس کو دیانت داری سے جانچا جائے اگر کوئی طالب علم ۵۰ فیصد نمبر حاصل کرتا ہے تو اس کو کچھ عرصے بعد اگلی جماعت میں ترقی دے دینی چاہیے کیونکہ وہ اس کا حقدار ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ اعراف میں ایسے لوگوں کو جنت دینے کی بشارت ہے۔

اگر کوئی طالب علم ایسا ہے جو کسی وجہ سے ۵۰ فیصد سے کم نمبرات ۴۸، ۴۹ یا اس سے قریب حاصل کرتا ہے اور مجموعی ریکارڈ اور مشاہدات اس کے اچھے ہیں تو اس کو بھی اگلی کلاس میں ترقی کی سفارش کی جا سکتی ہے کیوں کہ اس بات کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے نمبرات حاصل نہ کر سکا ہو۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

ترجمہ: بے شک نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ (۱۱:ھود۔۱۱۴)

مجموعی ریکارڈ:

اسلامی تشخیص قدر میں فرد کے تمام افعال کا ریکارڈ رکھا جائے گا اور ان ریکارڈ کو فرد کے سامنے یوم حساب میں دکھایا جائے گا تا کہ ہر فرد سزا و جزا کے لئے تیار رہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے نظام تعلیم میں چاہیے کہ طلباء کی ہمہ جہتی معلومات کے مجموعی ریکارڈ دیانت داری سے مرتب کریں۔ جس میں گھر، مدرسہ، کھیل کا میدان، دوستی کے انداز، دشمنی کا رویہ، بڑوں سے اور اساتذہ سے تعلقات گویا تمام افعال و مشاہدات کے ہر ہر لمحے کا ریکارڈ مرتب کیا جائے۔ اسلامی تشخیص قدر میں ہر فرد کو احتساب کرنا پڑتا ہے بعض اعمال کو خود دیکھنا پڑتا ہے اور راہ کا تعین کرنا پڑتا ہے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ اس ضمن میں ہم طلبہ کو ایسا کتابچہ دے سکتے ہیں جس کے ذریعے طلبہ خود اپنا ذاتی ریکارڈ مرتب کریں، اس سے ان میں احتساب و دیانتداری کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ دوسری جانب اسکول کے عملے کو چاہیے کہ مدرسہ کے ماحول میں طلبہ کے مشاہدات کر کے ریکارڈ تیار کرے۔ والدین کے ذریعے بچہ کے متعلق رائے اور معلومات حاصل کی جائے چوتھی جانب آزمائشوں میں حاصل کردہ نمبرات کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے۔ جو تشخیص قدر کے لئے بنیادی شرط کی

حیثیت رکھتا ہے۔

معیار:

جب آزمائش کے ذریعے نمبرات دے دیے جائیں تو مجموعی ریکارڈ کو سامنے رکھ کر اور حاصل کردہ نمبرات سال بھر کے آزمائشوں کے ذریعے یکجا کر کے طلبا کا معیار متعین کیا جائے پھر سال کے آخر میں طلبا کا معیار قائم کیا جائے جو "کیفی" اور "عددی" (مقداری) صورت پر منحصر ہو پھر اگلے درجے میں ترقی دی جائے۔

فکری و تحقیقی نشست کا اہتمام

مجلسِ تفسیر، جامعہ کراچی کے زیرِ اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو صبح دس بجے، ایک ماہانہ علمی و فکری و تحقیقی نشست کے اہتمام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جس میں اسلام اور اسلام کے تعلق سے پیدا ہونے والی مختلف النوع تحقیقات کو مقالات کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ ہر نشست میں کسی بھی ایک صاحب فکر و نظر اور محقق کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی اجازت ہوگی۔ مقالہ پیش کرنے یا اس نشست میں شریک ہونے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ وہ اپنا مقالہ پیش کرنے سے کم از کم ایک ہفتہ قبل، مجلس تفسیر کے سربراہ ڈاکٹر خلیل اوج سے رابطہ کرلیں۔ تاکہ مقالہ نگار اور ان کے عنوانِ مقالہ کی مناسب نشر و اشاعت قومی اخبارات کے ذریعے ممکن ہو سکے۔

مجلس میں پیش کیے جانے والے منتخب مقالات مجلّہ "التفسیر" میں شائع کیے جائیں گے۔

فکری نشست کا انعقاد C-43 اشاف ٹاؤن، یونیورسٹی کیمپس، یونیورسٹی آف کراچی میں کیا گیا ہے۔

برائے رابطہ: 021-4802368

0300-2236558

E-mail: sascom7@yahoo.com

اسلام اور دہشت گردی عصر حاضر کے تناظر میں

شاکر حسین خان

ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

اسلام دین فطرت و دین اکمل ہے، اس دین میں انسانی زندگی سنوارنے اور اسکی تعمیر کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے، یہ دین ایک مکمل نظام حیات رکھتا ہے، انسان اسلام کے پیش کردہ سنہرے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا و عاقبت دونوں سنوار سکتا ہے تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس دین کی تبلیغ کے لیے تشریف لائے اور آخر کار اس دین کی تکمیل جناب خاتم النبین رسول اللہ ﷺ پر آیت الیوم اکملت لکم دینکم (الخ) کے نزول کے موقع پر ۹ ذی الحجہ ۱۰ ہجری بمقام عرفات بروز جمعہ ہوئی[۲] اور اسلام کو تا قیامت آنے والے لوگوں کے لیے دین قرار دے دیا گیا، اس دین کو اللہ تعالیٰ نے بھی پسند فرمایا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ان الدین عند اللہ الاسلام[۳] "بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے، گویا دین سے مراد صرف اسلام ہے اور اسلام کے سوا باقی تمام ادیان باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ[۴] "اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین چاہے تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا"۔

دین کے ایک معنٰی جزا کے ہیں، دین کو دین اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ جزا کا سبب بنتا ہے

۵، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ملك يوم الدين ۶ "مالک روز جزا کا" اس آیت کے تحت جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رقم طراز ہیں "دین کا معنٰی ہے حساب اور جزا، لبید کہتا ہے حصادك يوما زرعت وانما يدان الفتى يوما كما هو دائن ،ثواب وعذاب کی تعبیر لفظ "دین" سے کرتا کہ پتہ چلے کہ یہ ثواب و عذاب بلا وجہ نہیں بلکہ ان کے اپنے اعمال کا طبعی ثمر ہے۔ ۷

اسلام کا مادہ اشتقاق سلم ہے اسکے لغوی معنٰی بچنے، محفوظ رہنے اور امن وسلامتی میں آنے کے ہیں، اسکے باب افعال سے لفظ اسلام بنا ہے جس کے معنٰی امن وسلامتی کے ہیں، اسلام میں امن وسلامتی کا مفہوم دو اعتبار سے موجود ہے ایک یہ کہ خود امن وسلامتی پالینے سے عبارت ہے اور دوسرا یہ کہ دوسروں کو سلامتی فراہم کرنے سے عبارت ہے۔ ۸

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ۹ کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (الخ) ۱۰ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس حدیث میں اسلام کا مادہ اشتقاق سلم موجود ہے گویا مسلمان ہونا، اسلام قبول کرنا نام ہے اپنے آپ اور دوسرے لوگوں کو محفوظ کرنے کا، خود کا اور دوسروں کو امن وسلامتی پہنچانے کا۔ ان معنٰی سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اسلام سراپا ہے امن وسلامتی کا، اگر انسان اسلام قبول کرلے تو وہ سلامتی پالیتا ہے اگر کوئی انسان کسی مسلمان کے پاس آجائے تو وہ سلامتی میں آجاتا ہے اگر کسی خطۂ ارض پر اسلام کا عملی نفاذ ہوجائے تو وہ جگہ دارالاسلام ہوجاتی ہے۔

سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا اسلامی فضائل اخلاق میں سے ایک خلق ہے، اسلام نے سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے کو اہمیت دی ہے، سلام کرنا مسلمانوں کا شعار اور اسلامی معاشرے کا رواج ہے لوگوں کو سلام کرنا مستحب اور سلام کا جواب دینا واجب ہے جناب رسول اللہ ﷺ نے یہود اور نصاریٰ کے سلام کا جواب دینے کا بھی حکم ارشاد فرمایا ۱۱ اور آپ کی سنت سے بھی ثابت ہے کہ آپ نے ایک ایسی مجلس کو سلام کیا جس میں متعدد مذاہب کے لوگ تھے ۱۲ "السلام علیکم" کے معنٰی ہیں آپ پر سلامتی ہو، سلام کو عام کرنے سے سلامتی کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس لیے اسلام میں سلام کرنے کا حکم موجود ہے۔ متعدد احادیث سلام کرنے کی فضیلت واہمیت پر وارد ہوئی ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْكَلَامِ ۱۳ یعنی کلام سے پہلے سلام کرنا چاہیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اذا انتهى احد

كم الى مجلس فليسلم فان بداله ان يجلس فليجلس ثم اذا قام فليسلم ۱۴ "جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے پھر اگر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو بیٹھ جائے اور جب چلنے لگے تو دوبارہ سلام کرے"۔ ایک حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ نزدیک وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے ۱۵ ایک حدیث میں آیا کہ اسلام کی سب سے اچھی عادت لوگوں کو کھانا کھلانا اور ہر آشنا و نا آشنا کو سلام کرنا ہے ۱۶ کھانا انسان کی اہم ترین ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا یہ رواج ہے کہ مختلف مواقع پر عزیزوں، دوستوں اور غریبوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ سلام کرنا سلامتی کی دعا ہے ان افعال پر عمل پیرا ہونے سے انسانوں میں آپس میں اُنس پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ سلام کرنا بعض اوقات لوگوں کو برائی سے روکنے کا بھی ذریعہ بن جاتا ہے برے لوگوں کو سلام کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا طریقہ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے و عباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا و اذا خاطبهم الجهلون قالوا سلما ۱۷ اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی اور وقار سے چلتے ہیں اور جب کوئی جذباتی ان سے الجھنے لگتا ہے تو وہ اس پر سلامتی بھیجتے ہیں (یعنی ان سے الجھتے نہیں)۔

صلوٰۃ (نماز) اسلام کا ایک اہم رکن ہے اسلام نے اس اہم ترین عبادت (نماز) میں بھی سلام کو فرض قرار دیا، مسلمان دوران نماز نبیوں ور اللہ تعالیٰ کے دیگر مقبول بندوں پر سلام پیش کرتے ہیں اور اختتام نماز اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوق کو بھی سلام میں شامل کرلیتے ہیں اسلام کے ماننے والے خود بھی سلامتی پاتے ہیں اور دوسروں پر بھی سلامتی کا باعث بنتے ہیں اسلام کے ماننے والوں پر دنیا میں بھی سلامتی ہے اور آخرت میں بھی سلامتی ہوگی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون ۔ ۱۸ "تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔ یعنی اسلام کا پیروکار ہر خوف وحزن سے نجات حاصل کرلیتا ہے، وہ سلامتی میں آجاتا ہے اس پر دنیا میں بھی سلام ہوتا ہے اور آخرت میں بھی، اس پر خالق کا بھی سلام ہوتا ہے اور مخلوق کا بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تحيتهم يوم يلقونه سلم ۱۹۔ انہیں یہ دعا دی جائیگی جس روز وہ اپنے رب کریم سے ملیں گے ہمیشہ سلامت رہو"۔

اللہ تعالیٰ جو ہمارا خالق و مالک ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے پیار ومحبت، امن وآشتی سے اس کی دھرتی پر مل جل کر رہیں، اس کی دھرتی پر اس کے متعین کردہ احکامات کا عملی نفاذ کریں اور نیکی